

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222262

UNIVERSAL
LIBRARY

Text Cut Book Only

**TEXT FLY WITHIN THE
BOOK ONLY**

Check

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. 19154333 Accession No. 14375-
Author: 5 2 15320.
Title: 14375-15320.

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

کیردار



اس نقور میں یہ دکھایا گیا
 تھا کہ اس نوجوان عورت جس نے
 سیتہ لکندہ حوالہ تھا اور راضی لطف
 سے زیادہ دیریاں کھینچے اور فوائے
 ہر پائل کفری صوفی کی آمد سے مراد از
 پیچھے سے اس کے سناؤں کو سمجھ گیا تھا
 ثور، مرد، ہر باتوں میں ماہر القادری
 حسن کو چھوٹ کر کے مسکرا رہی تھی
 جیم مرد اس میں جیم کو پسینہ پڑا تھا بلکہ کوہ
 لطف آہ اور ادارہ اشاعت اردو
 پبلشرز انجمن دہلی، حیدر آباد (دکن)

سے پانچہ کتابیں چکران حیدر آباد دکن

ایک ہزار

تعداد طبع

۱۹۴۲ء
فروری

عظیم
مطبع

رزاقی ٹشین پریس

حیدرآباد دکن





دولفظ



اردو زبان میں ناول نگاری مصنوعی کرداروں سے شروع ہوئی۔ تاریخی کرداروں سے گزری عام انسانوں کے حالات پر بھی کوئی نہ کوئی ناول مل ہی جائے گا لیکن کردار پیش کر نیوالے ناول ابھی تک کیا نہیں بلکہ نایاب ہیں۔ اہل ادب چاہے ناول کی منطقی تعریف کچھ بھی کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے کردار کی نوعیت کیساتھ ناول، بلکہ سارے ادب کا موضوع ہے۔

شاعر حیات ماہر القادری جس کے حیات انگیز نغمے ادارہ اشاعت اردو محسوسات اور نغمات کے ذریعہ پیش کر چکا ہیں، اس کتاب میں ”کردار“ انسانی کے رُپ انوپ دکھاتا ہے۔ آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں، اور دماغ بہت کچھ سوچتا ہے، لیکن نہ سب کچھ یاد رہتا ہے، اور نہ

سب آنکھیں اور سب دماغ یکساں دیکھ و سوچ سکتے ہیں۔ شاعر حیات کا دل، شاعر کا دل، دماغ شاعر کا دماغ اور قلم صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ادیب و شاعر کا مشترک قلم ہے، کردار نگاری میں جو کمال قلم نے دکھایا ہے اس کا نمونہ اس کتاب میں آپ کو ملے گا۔

کردار میں آپ کو پاکیزہ محبت، دلچسپ افسانہ، تہذیب نو پر لطف تنقید اور سماج کی واضح اور سچی تصویر سب کچھ ملے گا، اور اس طرح ملے گا کہ پڑھنے کے بعد آپ کو ماحول کے مطالعہ میں زاویہ نظر بدلنے کی ضرورت محسوس ہوگی، ساری باتیں زمینی اور آپ ہی کے ماحول کی ہیں صرف مطالعہ کا انداز جدا ہے اور لکھنے کا طرز دلچسپ بھی اور انوکھا بھی،

محمد اقبال سلیم گاہندی

قیصر پور

قیصر پور ایک متوسط درجہ کا قصبہ تھا جس کی آبادی آٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی، یہ قصبہ ریلوے اسٹیشن سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر واقع تھا ریلوے اسٹیشن سے قیصر پور تک پکی سڑک تھی دور دراز کی مہذب آبادی نام ہے خوشنما بنگلوں کشادہ اور مصفا سڑکوں باغیچوں، قصبہ داروں، رقص خانوں اور کھیل کے میدانوں کا اس اعتبار سے قیصر پور ایک بڑے گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا پرانی وضع کے مکان اور کچی سڑکیں اس قصبہ کی کائنات تھیں۔ البتہ بازار کی سڑک پختہ بنی ہوئی تھی جہاں وہاں کے دوکانداروں نے اپنی مہربانی سے جا بجا بڑی بڑی لائین نصب کر دی تھیں۔ قیصر پور کے رہنے والوں کے لئے یہ سڑک دہلی کے چاندنی چوک اور لاہور کی مال روڈ سے بھی بڑھ کر تھی۔ ریلوے روڈ نے آمد و رفت میں بہت کچھ سہولتیں بہم پہنچادی تھیں لیکن کچھ دن سے محکمہ تعمیرات کی بے توجہی کے باعث اس سڑک میں جا بجا گڑھے پڑ گئے تھے اور یہ نہ صراط مستقیم ”بحر خطرات“ جانے والی سڑک بن کر رہ گئی تھی۔ بات یہ ہے ہوئی کہ صوبہ کے صاحب گورنر بہادر نے اپنے کرم سے ضلع کو شرف و رود بخشنا تھا کہ سڑک بورڈ لگوانے لگا۔ گورنر بہادر کے استقبال میں اپنی نیاز مند لہر عقیدت کا وہ بے پناہ جوش دکھایا کہ سڑک بورڈ لگانے کا نڈیا بالکل دیوالیہ ہو گیا۔ دو چار ممبروں نے ان اندھا دھند انرجیاں دکھاتے ہوئے

کیا، مگر جس دنیا میں جاہ و دولت کی پوجا ہوتی ہو، وہاں کسی خاک نشین کی معقول سے معقول بات پر کان دہرنے کی فرصت کس کو ہے؟ گورنر صاحب تو پھولوں کے ہار پہن کر اور لنچ اور ڈنر کھا کر چلے گئے مگر ضلع کے باشندوں کو ڈسٹرکٹ بورڈ کے عجیب و غریب عقیدت کے ہاتھوں جو تکلیفیں اٹھانا پڑی ہیں، اُس کا سرسری اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک سال کے عرصہ میں، ضلع کی سڑکوں پر چلنے والی گاڑیوں کے بہت سے سیلوں کے کندھے بیکار ہو گئے۔ پختہ سڑک کے گڑھے کا ہچکولا، خدا کی پناہ! دن میں تانے نظر آنے لگتے ہیں۔ بوجہ اور بارش کی سبب سے

سرمایہ داری، افلاس کی مصیبت سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتی ہے، قیصر پور جانے والی سڑک کی شکست و ریخت نے یکے اور تانگے والوں کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ بڑے بڑے مضبوط گھوڑے جھٹکے کھا کر بیکار ہو گئے، ضلع کے ایک سرمایہ دار نے، یہہ حالت دیکھ کر، ضلع کی سڑکوں پر موٹر بسیں دوڑا دیں، سڑکوں کے گڑھوں کے بھرنے کے لئے، موٹر لاری کے مالک نے جا بجا مزدور مقرر کر دیے تھے جو درختوں کی ڈالیوں، پتوں، گھاس اور مٹی سے ان خندقوں کو پاتے رہتے تھے۔ موٹر لاریوں پر بھی کیا منحصر ہے، تہذیب حاضر کی ہر چیز کو دنیا میں قبولیت حاصل ہوتی ہے، اب یہہ دوسری بات ہے کہ موٹر لاریوں نے ایک شخص کا تو گھر بھر دیا۔ اور سینکڑوں غریبوں کے گھر تباہ کر دیے، اور یکے اور تانگے والوں کا لگا ہوا روزگار خاک میں مل گیا۔ پورے ضلع میں مشکل سے چالیس پچاس بیکے اور تانگے باقی رہ گئے تھے، جن کے مالک، موٹر لاریوں کی کچی سواروں کے کرایہ سے پیٹ پاتے تھے، ایک موٹر لاری، قیصر پور ریلوے اسٹیشن سے، قصبہ قیصر پور تک جاتی تھی۔ لاری کے ملازمین نے اپنا مستقر اسی قصبہ کو بنایا تھا۔

قیصر پور میں ایک مہاجن رہتا تھا جو نہ صرف اس قصبہ کا، بلکہ شاید ضلع کا سب سے زیادہ مالدار شخص تھا، اس مہاجن کا سود کا کاروبار دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا، اسی سود

کی بدولت اس نے بہت سے گھاؤں خرید لئے تھے کنجوسی میں تو وہ شاید قارون سے بھی دوپاٹے آگے
 تھا، اکڑاکے کے جاڑے معمولی رضائی میں، انگلیٹھی پر تاپ کر گزار دیتا۔ روپیوں سے تجوریاں بھری
 ہوئی تھیں، مگر ایک ایک کوڑی کو دانت سے پکڑنا، اس کنجوسی اور جزی رسی کے ساتھ ساتھ حکومت
 سے خطاب حاصل کرنے کی اُس کو ہوس نہیں، جنون تھا کلکٹر صاحب کے بنگلہ کو جانی والی سڑک
 کا ذرہ ذرہ اُس سے واقف تھا، اُس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا، بلکہ شاید آخری تمنا
 یہی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح 'رائے بہادر' ہو جائے۔ وہ کئی سال سے خطاب حاصل کرنیکی
 کوشش کر رہا تھا، ایک دو مرتبہ صاحب ضلع نے اُس کی سفارش بھی کر دی تھی، لیکن اوپر والے
 لوگوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ اور وہ اس لئے کہ نہ تو سپیک میں اُس کو کوئی قبولیت حاصل تھی، اور
 نہ اُس نے حکومت کی کوئی قابل قدر خدمت انجام دی تھی، صرف کلکٹر صاحب کی ڈالیوں سے
 'رائے بہادر' کا خطاب تھوڑی مٹا ہے۔ کوئی فوجی افسر ضلع میں کلکٹر ہو کر آگیا تھا، اُس سے اس
 کنجوس مہاجن کے تعلقات خوشگوار ہو گئے، کلکٹر نے اس کو مشورہ دیا کہ خطاب حاصل کرنے کیلئے
 پہلک کی نگاہوں میں بھی تھوڑا بہت مقبول ہونا چاہیئے اور اس کے لئے کسی نمایاں کام کی
 ضرورت ہے، جاڑوں کے زمانہ میں گورنر بہادر ضلع میں آئیوا لے ہیں، تم ایک بڑی رقم اپنے قصبہ
 میں اسکول قائم کرنے کے لئے دیدو۔ خطاب کی تمنا نے اُس مہاجن کو اندھا بنا دیا تھا، گورنر کے
 آنے پر اُس نے بہت بڑی رقم، اسکول کے قیام کے لئے دیدی، اور قصبہ قیصر پور میں ٹل اسکول
 قائم ہو گیا، اور چند ہی سال میں اس کو ہائی اسکول بنا دیا گیا۔ ہمارے ہندوستان کے سیکڑوں
 اسکول دو خانے، اور پہلک ادارے، صرف نام و نمود، اور حکومت میں رسوخ حاصل کرنیکی
 نیت سے قائم کئے گئے ہیں، ورنہ خود غرض سرمایہ داروں کو کسی دوسرے کی بھلائی کے لئے کچھ
 سوچنے کی فرصت کہاں ہے؟ وہ تو یہہ سمجھتے ہیں کہ ان کو خدا نے قند و گلاب کا نہرہت پہنچے اور

خس کی ٹٹیوں میں رہنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے، اُن کو دولت عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کیلئے ہی دی گئی ہے، اب سمانِ عشرت اور اسبابِ عیش کی فراہمی کے سلسلہ میں کسی کو خود بخود فائدہ پہنچ جائے، تو یہ دوسری بات ہے، ورنہ قدرت کی اس جہتی اولاد کو مزبور کے ماتھے سے ٹپکتے ہوئے پسینے اور دہقان کے ”خون گرم“ سے ہمدردی ہو ہی نہیں سکتی۔

اسی مہاجن کے قائم کئے ہوئے اسکول میں توفیق اور شمشادِ تعلیم پاتے تھے، توفیق اور شمشاد ایک ہی محلہ کے رہنے والے تھے، بچپن سے ان دونوں کا ساتھ رہا تھا، اسکول میں ایک ہی جماعت میں داخل ہوئے، اور چھ سال تک مسلسل ساتھ ساتھ پڑھتے رہے یہ دونوں دوستی اور محبت کے فلسفیانہ مفہوم سے بالکل ناواقف تھے، لیکن اگر دوستی، طبیعتوں کی ہم رنگی، مزاجوں کے اتحاد، خیالات کی یک جہتی اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا نام ہے، تو شمشاد اور توفیق بڑے گہرے دوست تھے، وہ ایک دوسرے کی رائے سے بہت کم اختلاف کرتے تھے، جہاں ایک نے کوئی بات کہی دوسرے نے اُسے فوراً منظور کر لیا۔ ان کی دنیا دلائل و تفکر کی گنجینوں سے بالکل پاک تھی، یعنی، خوشی، اعتماد اور ہمدردی اُن کی زندگیوں میں گھل مل گئی تھی، وہ ایک دوسرے سے بہت ہی کم خفا ہوتے تھے، اُن کی دوستی بہت زیادہ گہری نہیں تو اتنی اُتھلی بھی نہ تھی، کہ خفگی اور بد مزگی کے خس و خاشاک کی اس میں سمائی نہ ہو سکے توفیق اور شمشاد میں مشکل سے ڈیڑھ دو سال کی چھوٹی بڑائی تھی، شمشاد، توفیق سے عمر میں چھوٹا تھا، لیکن توفیق سے قدرے بہت زیادہ لالبا اور موٹا تازہ تھا۔ تنوتند، نوجوان ذرا طبیعت کا بھی تیز مزاج تھا، شمشاد کے مزاج میں بھی تیزی تھی، لیکن ”تیزی“ کا لفظ سن کر اگر آپ نے شمشاد کو درشت مزاج اور چڑچڑا تصور کر لیا، تو آپ نے اُس غریب پر درحقیقت ظلم کیا۔ تیزی اور جوش تو جوانی اور صحت کے لازماًت سے ہیں، خون کی گرمی اور اعصاب کی توانائی سے، قدرت و طبیعت کی

بہر حال متاثر ہونا چاہیئے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ پانی کا جتنا دباؤ زیادہ ہوتا ہے۔ اتنا ہی فوارہ کا پانی زیادہ اونچا اچھلتا ہے، شمشاد، فطری اور طبعی طور پر تیز و طرار تھا لیکن ہنس مکھ، خوش طبع اور بہت جلد گھل مل جانے والا، وہ شخص سے خلوص و محبت کیساتھ ملتا، لیکن جہاں کہیں ہے یہ محسوس ہوتا کہ اس کی خود داری کو ٹھیس لگ رہی ہے، تو وہ اپنے قابو میں نہ رہتا۔ خود داری اس کی نازک ترین رگ تھی، جس کو کوئی ہلکے سے بھی چھو دیتا، تو اس کا نظام زندگی تہ و بالا ہموار تھا۔

قیصر پور کی سڑک کے سلسلہ میں موٹر لاری کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، اس موٹر لاری کے ملازمین، شہر کے رہنے والے تھے، تنخواہ کے علاوہ اوپر سے بھی آمدنی ہو جاتی تھی، یہ لوگ خوب مزے کی زندگی بسر کرتے تھے، توفیق اور شمشاد کے محلہ ہی میں یہ لوگ رہتے تھے، اور چونکہ اچھے پوش اور چرب زبان تھے، اس لئے اسکول کے لڑکوں کے لئے ان کی صحبت بہت زیادہ پسند کی جاتی تھی۔ توفیق اور شمشاد ان لوگوں کے پاس اکثر آکر بیٹھتے تھے، ان لوگوں کے لئے نئے تراش کے کپڑے، سگریٹ کیس، بجلی کی لٹینیں، حجامت بنائے کا سامان، پوڈر، کریم، مفلز، ٹکٹائی سینٹ، دانت ماسجھنے کے برش، الہم، گراموفون، غرض تمام چیزیں نوجوانوں کے لئے بہت زیادہ دلچسپی اور ترغیب و تحریص کا باعث تھیں، موٹر لاری کے ملازمین کے یہاں، نوجوانوں کا جمگھٹا رہتا۔ اور یہ صحبت آہستہ آہستہ رنگین ہونے لگی۔ گراموفون کے ریکارڈوں کی نوجوان نقل کرتے، کوئی تالی بجاتا، کوئی دوختابوں کو زانو پر رکھ کر، طبلہ کا کام لیتا اور کوئی اپنی آواز میں خوش گلو، ایکڑ مسوں کی آواز کا لوح پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ موٹر لاری کا ڈرائیور اور ٹکٹ چیکر، دونوں شعر کہتے تھے، ان کی دیکھا دیکھی، کئی نوجوان بھی شاعر بن گئے، قفس شاعری کے نوگرماءوں سے ٹکٹ چیکر اور ڈرائیور نے کہا، کہ کسی سے دل لگائے بغیر، شاعری نہیں چھنی، دل میں درد نہ ہو، تو شعر کیا خاک مزادے گا۔ نوجوانی کی امگلیں، اور شاعر کا شوق،

تو پھر عاشق بننے میں کیا دیر تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے نوجوانوں نے قصبہ کی لڑکیوں پر عاشق ہونا شروع کر دیا۔ اور بہت سے اچھے، خاصے بھلے مانس ”نوجوان“ شاعر اور عاشق بن کر رہ گئے۔

موٹر لاری کے ملازمین کے پاس، توفیق اور شمشاد کا اٹھنا بیٹھنا بہت زیادہ تھا۔ یہہ ملازمین بھی بڑے حرفوں کے بنے ہوئے تھے، نوجوانوں کو اپنی عشق، عاشقی اور ہوس کاری کے کچھ نوکڑے ہوئے۔ کچھ سنے سنائے اور کچھ گھرے ہوئے واقعات سناتے رہتے، ”ابنِ مغلین“ گناہ نے، ”معصوم نوجوانوں کے دلوں میں یہہ بات اتار دی تھی کہ قصبہات اور دیہات کی زندگی چوپایوں کی زندگی سے بدتر ہے، ”دہلی، بمبئی اور کلکتہ جیسے شہر انسانوں کے رہنے کے قابل ہیں جہاں کیفیت و سرستی کی بارش ہوتی ہے، اور قدم قدم پر رنگین مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ یہہ لوگ بڑے بڑے شہروں کے واقعات، اس انداز سے سناتے کہ نوجوانوں کے بدن میں سنسنی پیدا ہو کر رہ جاتی، کتنی دلچسپ اور گمراہ کن ہوتی تھیں ان لوگوں کی باتیں۔

ایک نوجوان کو اُس کے باپ نے کسی بات پر خفا ہو کر گھر سے نکال دیا، وہ لڑکا سیدھا کلکتہ چھو نچا۔ کئی دن تک بیچارہ ادھر، ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر بڑی دؤر دھوپ کے بعد، ایک پارسی کے یہاں اُسے نوکری مل گئی، پارسی کے گھر کا سودا سلف لانا اُس کے ذمہ تھا، پارسی کی لڑکی بالکل نوجوان تھی، صورت دیکھو تو چاند کا ٹکڑا، اس لڑکی سے نوجوان کی آنکھ لڑ گئی، ایک آدھ مہینہ تو دونوں چھپ چھپ کرتے رہے، ایک دن موقعہ پا کر، لڑکی نے لاکھوں روپیہ کا قیمتی زیور لیا، اور نوجوان کے ساتھ بھاگ گئی۔ اب، نوجوان اور پارسی کی لڑکی کو تہبو

میں مزے اڑا رہے ہیں۔

اجی! یہ تو ایک واقعہ بیان کیا ہے، ایسے سیکڑوں واقعے ہمیں یاد ہیں۔ پارسیوں، گجراتیوں اور ماڑواڑیوں کے یہاں بس۔ ذرا نوکر ہونے کی دیر ہے، پھر تو چاندی ہی چاندی ہے۔ شہر کی عورتیں تو گھاؤں اور قصبہ والوں پر جان دیتی ہیں، پھر کہیں ہمارے تو فقیروں اور شمشاد جیسے نوجوان پہنچ جائیں، تو نوجوان لڑکیاں ٹوٹ ہی تو پڑیں۔

گھاؤں اور قصبوں کی بھی کوئی زندگی ہے، لا حول ولاقوۃ، دن بھر خاک پھانلو، اور رات بھر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنو، یہاں تو آدمی کی قسمت پھوٹ جاتی ہے۔ ترقی کا کوئی میدان ہی نہیں ہے۔

یورپ کا رہنے والا، ایک فقیر بھیک مانگتا، مانگتا بمبئی پہنچ گیا ایک دن وہ سہ ماہی کے کنارے ملھاریں لگاتا ہوا جا رہا تھا، اسے ریت پر ایک چمکتی ہوئی چیز نظر آئی، فقیر نے اس چیز کو اٹھالیا، اور اس کو پتھر سے توڑا تو کبوتر کے انڈے کی برابر موتی، سیپی سے نکلا، وہ اس موتی کو لیکر جوہری بازار پہنچا۔ اور وہاں کھڑے کھڑے تیس ہزار میں موتی بک گیا۔

اور ہاں! اس یورپین فقیر ہی پر کیا منحصر ہے، اس جیسے ہزاروں فقیر، دولتمند بن گئے، لوگ خالی ہاتھ پہنچے، اور اشرافیاں جیبوں میں بھر کر لائے۔

کلکتہ اور دہلی میں تو ہمیں برستا ہے، انگلستان کے شاہزادہ کی ایک سیٹھ نے دعوت کی تو خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی چالیس ہزار روپیہ کے نوٹ جلا کر، شاہزادہ کے لئے چائے تیار کرائی۔

قصبہ کے نوجوانوں کے لئے، شہر کی رنگین معاشرت اور سنہری مواقع کی داستانیں ہی تو رغیب اور تحریص کا باعث تھیں۔ موٹر لاری کے ملازمین کی اسس ہم جیسی اور صحبت کا

یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے لڑکے عملی طور پر نہیں تو کم از کم خیالی طور پر آوارہ ہو گئے۔

پرویس میں

’توفیق اور شمشاد‘ نویں کلاس میں پڑھتے تھے، سالانہ امتحان سے تین مہینہ پہلے شمشاد میعادِ بخار میں مبتلا ہو گیا، بخار نے بہت طویل کھینچا، اور وہ سالانہ امتحان میں شرکت کے قابل نہ ہو سکا۔ توفیق نے محنت تو بہت کچھ کی تھی، مگر ہماری تعلیم کے نصاب کو دیکھ کر کسی ذہن سے ذہین اور محنتی سے محنتی طالب علم کے متعلق بھی کامیابی کی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ توفیق غیر معمولی ذہین نہیں تو اتنا کم ذہین بھی نہ تھا، کہ نویں کلاس کے نصاب کو محنت و کوشش کے باوجود پورا نہ کر سکے۔ لیکن سالانہ امتحان کے ختم ہونیکے بعد جب نتیجہ سنایا گیا ہے، تو کامیاب لڑکوں کی فہرست میں ’توفیق کا نام نہ تھا۔ بات یہہ ہوئی کہ تاریخ کے پرچہ میں ’توفیق کو خاطر خواہ نمبر نہ مل سکے۔ اُس نے تاریخ کے پرچہ کے سوالات کا جواب، تاریخ کی اُس کتاب کے خلاف دیا، جو نویں کلاس میں پڑھائی جاتی تھی۔ توفیق نے اپنی رائے کے ثبوت میں بہت سے تاریخی حوالے بھی پیش کئے، اور تصریح کے ساتھ بتایا کہ جو کتاب نویں کلاس کے کورس میں شامل ہے، اُس میں بہت سے واقعات تاریخی نقطہ نگاہ سے غلط ہیں، لیکن جس دنیا میں، طالب علم کے دل و دماغ کو چند مخصوص کتابوں اور نظریوں کا پابند کر دیا جاتا ہو، وہاں سب توفیق کی کون سننا تھا۔ یہ ہر حال توفیق کی قسمت میں ناکام ہونا لکھا تھا، او قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہا۔

توفیق کی ناکامی نے تمام گھروالوں کو متاثر کیا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے

کسی جوان موت کا اس گھر میں سوگ منایا جا رہا ہے، توفیق کو سب لوگ خفگی اور ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بات بات میں غریب پر ڈانٹ پڑتی تھی۔ گھر والوں کے تیور دیکھ کر توفیق کو بڑا دکھ ہوا، اور وہ اپنے عزیز واقارب کی صحبت سے کترانے لگا۔ توفیق کے گھر والوں کی ناراضی کسی طرح کم نہ ہوتی تھی، ایک دفعہ تو کسی بات پر توفیق کے باپ کے منہ سے نکل ہی گیا۔

”توفیق! کاش تو پیدا نہ ہوا ہوتا اور میری“

”مجھے بڑھاپے میں یہہ غم نہ اٹھانا پڑتا“

اول تو گھر کی موجودہ زندگی سے توفیق بدول ہو گیا تھا، دوسرے موٹر لائی کے ملازمین نے اس کے دل میں یہہ بات اتار دی تھی کہ کلکتہ، بمبئی جیسے شہروں میں بس پہونچنے کی دیر ہے، لکشمی دیوی خود ہی چرنوں پر ماتھا ٹیک دیتی ہے۔ توفیق کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ اس کے بچپن کے دوست شمشاد کی جدائی تھی، وہ کئی دن تک ایسی پس و پیش میں رہا اور شمشاد کی محبت اس کے دامنِ عزم کو تھامے رہی، شمشاد کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے باہر جانا پڑا، اور توفیق نے ایک دن موقع پا کر گھر سے کچھ روپیے لئے، اور سیدھا کلکتہ پہونچا۔

توفیق کا پورا بچپن اور جوانی کے چند سال، قیصر پورہ ہی میں بسر ہوئے تھے، کلکتہ کے ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر اس کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ گئے۔ آئینہ خانہ میں جیسے کتاب کھلا جاتا ہے، بالکل اسی طرح توفیق کلکتہ کی سڑکوں پر پھرتا تھا۔ موٹروں کی کثرت، عالیشان مکان، چوڑی اور صاف سڑکوں پر لوگوں کی گہما گہمی، غرض ایک ایک چیز توفیق کے لئے عجیب اور جاذب توجہ تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا، گویا کون سے

۱۶
قبرستان سے اٹھا کر کسی فیکٹری میں پہنچا دیا گیا ہے۔ ماسا داسدیا علیہ ۲

توفیق کئی دن تک ادھر ادھر بیکار پھرتا رہا، غیب گھومتے گھومتے طبیعت بھر گئی، تو فوری کے لئے دوڑ دھوپ شروع کی۔ کلکتہ جیسے شہر میں، جہاں بی اے ایم۔ اے روزگار کی تلاش میں جوتیاں چٹختے پھرتے ہیں، ایک نوں کلاس تک پڑھے ہوئے چھوکرے کو کون پوچھتا تھا۔ توفیق نے بیسیوں کارخانوں اور دفاتروں میں، درخواستیں بھیجیں، مگر ہر جگہ سے انکاری جواب ملا، توفیق جو کچھ روپیہ پیسہ گھر سے لایا تھا، وہ قریب قریب ختم ہو گیا، اب اس کے لئے بڑی دشواری کا سامنا تھا۔ پر دیس بے روزگاری، ناکامیاں، یہ تمام چیزیں مل جل کر، اُس کے لئے وبالِ جان بن گئی تھیں۔ توفیق نے اگرچہ عیش و عشرت اور ناز و نعم میں پرورش نہیں پائی تھی، اُس کے باپ کا قصبہ کے غریب لوگوں میں شمار ہوتا تھا، لیکن اُس کو بہر حال دو نو وقت پکی پکائی روٹی، اور پہننے کے لئے، کپڑے، بیفکری کے ساتھ مل جاتے تھے، کلکتہ میں اگر اُس کو قدر ہوئی کہ پیٹ بھرے اور تن ڈھانکنے کے لئے آدمی کو کیسے پا پڑ بیٹنے پڑتے ہیں۔

خدا کی مدد، اور غیبی تائید، اس عالم اسباب میں، اسباب کے ہی ذریعہ ہوتی ہے۔ جب خدا کسی بھوکے کی امداد فرماتا ہے، تو کسی انسان کے دل میں بھوکے کیلئے رحم کا جذبہ پیدا کرتا ہے، اور وہ آدمی بھوکے کو کھانا کھلا دیتا ہے، آسمان سے کبھی انسان کے لئے علوے کے طباق، فریضی کے پیالے اور آچار کے مرتبان نازل نہیں ہوتے، اور نہ کسی غریب اور مفلس کے گھر کے انجن میں اشرفیوں اور روپیوں کی بارش ہوئی، توفیق کو بھی خدا کی تائید، ایک بنگالی نوجوان کے بھیس میں حاصل ہوئی، یہ بنگالی نوجوان

ایک کارخانہ میں کلرک تھا توفیق سے اس کی صاحب سلامت ہوئی، آدمی تھا ملنسار اور مطیع، توفیق اس کے پاس آئے جانے لگا، اور جب اس نوجوان کو یہ معلوم ہوا کہ توفیق بیروزگاری کے ہاتھوں تباہ اور پریشان ہے، تو اُس نے اپنے ایک دوست سے کہہ سُن کر توفیق کو ایک پارسی کے یہاں نوکر رکھا دیا۔

پارسی کے یہاں کوئلہ کی ایک سیسہ تھی، کاروبار تو زیادہ بڑا نہ تھا، پھر بھی اُس کی اتنی آمدنی تھی کہ اُس کے یہاں ایک چھوڑا دو دو تین تین موٹر تھے۔ توفیق کے ذمہ مزدوروں کی نگرانی اور اُن کی حاضری کے رجسٹر کی خانہ پُری تھی، توفیق نے ہٹل کی رہائش ترک کر دی تھی، اور وہ اپنے بنگالی دوست کے یہاں اُٹھ آیا تھا۔ توفیق کے یہاں چلے آئے میں دونوں کو کفایت ہوئی، توفیق تو ہٹل کو بھاری کرایہ سے بچ گیا، اور بنگالی نوجوان پر اب کمرہ کے کرایہ کا ادھا بار رہ گیا۔ دونوں دوست ہنسی خوشی کیساتھ رہنے لگے۔

جس پارسی کے یہاں توفیق ملازم تھا، اُس کی لڑکی کا نام زمرہ تھا۔ زمرہ پیش برس کے لگ بھگ تھی، پارسی عورتیں عام طور پر گوری چٹی اور کشیدہ قامت ہوتی ہیں، زمرہ میں ان دونوں خصوصیتوں کے علاوہ، تناسب جسمانی اور ناک نقشہ کی موزونیت بھی پائی جاتی تھی، توفیق نے جب اُس کو پہنی دفعہ دیکھا ہے، تو اُس کے حافظہ نے، اُن تمام واقعات کو اُسکی نگاہوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا، جو اُس کے وطن قیصر پور میں، موٹر لاری کے ملازمین گھاؤں کے لوگوں کو سنایا کرتے تھے، توفیق کو یقین ہو گیا تھا، کہ اُس کا ستارہ گردش سے نکل گیا، اور پارسی کی لڑکی دو چار دن میں اُس پر عاشق ہو ہی جائے گی۔ توفیق ایک ایسا خواب دیکھ رہا تھا، جس کی تعبیر وہ خواب دیکھنے سے بہت پہلے خود ہی متعین کر چکا تھا۔ اس نے اپنے بنگالی دوست سے بھی اپنے دل کی بات چھپائی، اور وہ اس لئے کہ توفیق اس روشن مستقبل اور حسین کامیابی میں اپنے بنگالی دوست کو کسی طرح

اپنا شریک اور سہارا بنانا نہیں چاہتا تھا۔ توفیق نے جو پلاٹ تیار کیا تھا اُس کے لحاظ سے یہ چھپانے کی بات بھی تھی، ایسی کامیاب اور حین اسکیمیں کہیں یاد دوتوں کو بتائی جاتی ہیں۔

پارسی کی لڑکی زمرہ جب دفتر میں آتی تو توفیق اُس سے بات چیت کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی موضوع تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ زمرہ کو اس کا بھولے سے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا، کہ اُس کے بیان کا ایک معمولی سا نام جس کے بدن کا لباس بھی درست نہ تھا، اُس سے عاشقی کر سکتا ہے، زمرہ کو توفیق سے بات چیت کرنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی، لیکن توفیق ہمیشہ کسی نہ کسی عنوان سے بات چیت کر ہی لیتا۔ یہہ عنوانات، اگرچہ بے تکیے ہوتے تھے، مگر اُن کا تذکرہ دیکھا جائے گا، تو افسانہ نگار، کتاب پڑھنے والوں پر بڑا ظلم کرے گا۔

_____ مس صاحبہ! دیکھئے چوترے کی سیڑھی پر آہستہ سے پیر رکھئے۔ توفیق نے کہا
_____ آخر کیوں! یہ تم آج کیا نئی بات کہہ رہے ہو۔ پارسی کی لڑکی زمرہ نے جواباً
_____ کل شام ایک دلال، سیٹھ صاحب سے ملنے کے لئے آیا تھا، اس سیڑھی
پر پیر رکھتے ہی گر پڑا۔ معمار کی غلطی سے پھسلنے والے پتھر اس چوترے
میں گکا دئے گئے ہیں۔ _____ توفیق، زمرہ کو خوب غور
سے دیکھتے ہوئے بولا۔

_____ مس صاحبہ! کل شام ہمارے محلہ میں آگ لگ گئی بیچارے، چینی ڈاگر
کا ہزاروں کا نقصان ہو گیا۔ _____ توفیق نے غم انگیز لہجے میں
کہا۔ _____

_____ میں نے تو آج کا اخبار بہت غور سے پڑھا ہے، اس میں یہہ خبر درج
نہیں ہے۔ _____ زمرہ نے جواب دیا

— اچی ! ان اخبار والوں کو خدا غارت کرے، معمولی معمولی خبروں کو چھپ دیتے ہیں، اور بڑی بڑی خبروں کا ذکر تک نہیں کرتے — توفیق قدرے گھبرا کر بولا —

توفیق کی روز کی گفتگو کے عنوانات کس قدر دلچسپ ہوتے تھے: —

— مس صاحبہ ! ہمارے محلہ میں ایک صاحب کل ہی انگلستان سے آئے ہیں وہ کہتے تھے کہ فروری نہیں تو مارچ کے شروع میں ضرور جنگ چھڑ جائیگی — ناخدا کی مسجد سے کچھ دور پر، ایک نجوی آکر ٹھہرا ہے جو ذرا سی دیر میں تمام اگلے پچھلے حالات بتا دیتا ہے۔

— آپ کئے بچپن کا فوٹو، میں نے ایک فوٹو گرافر کے یہاں دیکھا تھا آپ کے چہرے میں اب تو بڑی تبدیلی ہو گئی ہے، بہت سے دیکھنے والے تعریف کر رہے تھے، کہ اس سے بہتر پوز (ہم نے نہیں دیکھا —) میں تو اتنی جرات نہیں کر سکتا، آپ کسی طرح سیٹھ صاحب کے کان میں یہ بات ڈال دیجئے، میں نے کل سنا ہے کہ کوئٹہ کا بھاؤ، اب گرنے والا ہے، اس لئے کوئٹہ ذرا احتیاط کیساتھ اور ہاتھ روک کر خریدیں۔

— یہ ہو گور کھے بلا کے کام کر نیوالے ہوتے ہیں، ہمارے یہاں بھی کچھ گور کیے ضرور ملازم رہنے چاہئیں۔ کل ایک پور بیے کی گردن میں کوئٹہ کا بورا ٹھانے ہوئے جھٹکا اگیا، دوسرے مزدور بھی کہنے لگے کہ ایک تھیلے میں سوا من سو زائد کوئٹہ نہیں ہونا چاہیئے —

— مس صاحبہ ! آج کل شہر میں چوری اور نقب زنی کے بہت سے واقعات

ہو رہے ہیں، دیکھئے! ہمارے کارخانہ کا پھانک کتنا کم۔ دراور پرانا ہو گیا ہے، اس کے بدلوانے کی ضرورت ہے۔

_____ کل مجھے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ ریاست حیدر آباد دکن میں ایک جاگیدار کے یہاں، اُس قالین کا ایک ٹکڑا ہے، جس پر شاہجہید بیٹھ کر شراب پیا کرتے تھے۔

_____ آپ کو زکام ہو رہا ہے، آپ فرمائیں تو میں یونانی دوا خانہ سے ایک مجرب اور آزمودہ دوا لاکر پیش کر دوں۔

زمرہ توفیق کی باتوں کو سن کر مسکراتی، زمرہ کی یہ مسکراہٹ، توفیق کی ہمت کو بڑھا دیتی تھی، اور اُسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ لڑکی کے دل میں اُس کی محبت کا نشتر آہستہ آہستہ اتر رہا ہے، اور بس کوئی دن میں معرکہ سر ہوا چاہتا ہے وہ اب پارسی کے کارخانہ کو اپنا گنا سمجھتا تھا، اور وہ اس لئے کہ زمرہ پارسی کی اکلوتی لڑکی اور تنہا وارث تھی، اور چونکہ اُس نے یہ فرض کر لیا تھا، کہ زمرہ کچھ دن میں اُس کی ہو جائیگی، اس لئے منطقی طور پر نہیں، بلکہ ریاضی کے مسئلہ اصول کے طور پر تمام جایدا کا وہ بالواسطہ مالک ہو جائیگا۔

زمرہ جب کبھی کارخانہ میں آتی، تو توفیق کی نگاہیں اُس کی ایک ایک ادا کا جائزہ لیتیں۔ زمرہ کی نشست و برخاست، چال، ڈھال، گفتگو، غرض اُس کی ایک ایک حرکت کو توفیق گہری نگاہوں سے دیکھتا۔ اور پھر گھر پہنچ کر، تنہائی کے عالم میں، دل ہی میں تنقید کرتا۔

_____ مجھے ہی دیکھ کر مسکراتی تھی، اور ہاں! میں گیا بھی تو تھا، نیا کوٹ پہن کر اور بال سنوار کر!

ہاں! اُس نے رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے، میری طرف کچھ یوں ہی سا اشارہ بھی کیا تھا۔ میں بھی بڑا اٹو ہوں، وقت سو فائدہ اٹھانا نہیں جانتا۔ مجھے اُس کے اشارہ کا جواب دینا چاہیے تھا۔

_____ اچھا، تو وہ جب مجھ پر مرتی ہے تو کھل کر بات کیوں نہیں کرتی۔ مگر ہاں! وہ بیچاری بھی تو مجبور ہے، اُس کا باپ کتنا سخت واقع ہوا ہے۔ _____ محبت میں جدائی اور شرم و حیا کی الجھنیں اور کشمکش نہ ہو، تو محبت میں لطف ہی نہیں آ سکتا۔ محبت تو تڑپنے اور تڑپانے ہی کا نام ہے، مگر اب یہ منزل بھی بہت قریب آچکی ہے۔

_____ آج اُس نے میرے سوال کا جواب دیتے وقت مجھے بڑے غور سے دیکھا تھا، جیسے کوئی کسی سے اپنے دل کی بات کہنا چاہے، اور کسی مجبوری کے سبب نہ کہہ سکے، اور اُس نے آج اپنے بالوں میں دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر جو بہت سی گہری لگائی تھیں، اُس کا آخر مقصد کیا تھا۔ _____ یہی کہ وہ مجھے بھانا چاہتی تھی۔ میرا رنگ تو خیر اُس کے رنگ سے پھیکا ہے، مگر ناک، نقشہ تو بُرا نہیں ہے، اور پھر مجھ میں نہ حُسن بھی تو پایا جاتا ہے، اُس کو ضرور مجھ سے تعلقِ خاطر ہو گیا ہے۔

_____ سچ کہا ہے کسی نے کہ آدمی کی قدر وطن سے باہر ہوتی ہے۔ بس اب کچھ دن کی دیر ہے، پھر تو چاندی ہی چاندی ہے۔ لیکن ہاں ایک بڑی غرابی ہے کہ وہ پارسی ہے، اور میں مسلمان۔! پھر شادی کس طرح ہوگی، مگر۔ ہاں۔! جب وہ مجھے ہی اپنا سب کچھ بھیگی،

تو پھر اُس کو مسلمان ہونے میں کو نسا امر مانع ہو گا۔ اور اگر کچھ دیکھ
یوں ہی محبت جاری رہی، تو اس میں ایسا کو نسا ہرج ہے۔ محبت میں تو
کفر و اسلام کی تمیز اُٹھ جاتی ہے، اور ہمارے شاعروں نے تو معشوق کو
ہمیشہ ”کافر“ ہی کہا ہے۔

اس قسم کی باتوں سے توقیق اپنے دل کو تسکین دیتا تھا، شاعر نے کچھ دیکھ کر ہی کہنا
برق کی سی چشمک تھی، وہ نگاہ بے پروا
اس پہ آرزو کیا کیا، حاشیے چڑھاتی ہے

توقیق بھی نہ صرف حاشیے چڑھا رہا تھا، بلکہ تمنائوں اور اُمیدوں کے حسین قلعے
تیار کر رہا تھا، ایسے قلعے جن کے کنگرے عرش سے اونچے نکل گئے تھے، اور جن کا ماحول
حسن و دولت کے خیالی مسالے سے تیار ہوا تھا۔ توقیق نے بہت دن تک گفتگو اور نظارہ
اکتفا کیا۔ مگر اب اُس کے دل کی بے چینی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتی تھی، وہ صرف موقع
کی تلاش میں تھا۔ ایکن پارسی اتفاق سے بیمار ہو گیا، اور اُس کا میجر کوئلہ کے سوداگروں کا
کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے استنبول چلا گیا۔ ریلوے اسٹیشن پر پارسی کے گودام کے لئے
کوئلہ کے بہت سے ڈبے آئے ہوئے تھے، ریلوے کے ملازمین کی کسی غلطی کے باعث ڈبوں
پر بہت زیادہ ڈیمرج لگا ہوا گیا۔ اس سلسل میں ریلوے مال گودام کے سپرنٹنڈنٹ
سے ملنے کی ضرورت تھی، پارسی نے زمر دے کہا، کہ تم جا کر اسٹیشن کے ذمہ دار افسروں سے
بات چیت کرو، اگر میجر کے آنے کا انتظار کیا گیا تو اور زیادہ ڈیمرج دینا پڑیگا۔ پارسی
نے ضروری کاغذات توقیق کو دیدی، اور زمر د اور توقیق، موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔
توقیق کی مسرت کا عالم نہ پوچھیے، اُس کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا، اُسے یقین

تھا کہ آج تمام معاملات طے پا جائیں گے، اور قدرت نے اُس کو یہ ایسا سنہری موقعہ دیا ہے، موٹر روانہ ہوئی، اور توفیق نے لپجائی ہوئی نظروں سے زمرہ کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ زمرہ توفیق کی نگاہ بازی سے بالکل غافل تھی، وہ اطمینان کیساتھ بازار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ توفیق نے جب دیکھا کہ ٹکی، اُس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتی تو اُس نے خود ہی اقدام کیا۔

_____ مس صاحبہ! آپ آج بہت خاموش ہیں، اب تو بولنے کی ضرورت ہے۔ _____ توفیق نے حسرت کیساتھ کہا۔ _____

_____ اب بولنے کی ضرورت ہے، اس سے تمہارا مطلب کیا ہے _____ زمرہ نے قدرے خفگی کیساتھ جواب دیا۔ _____

_____ بھئی _____ آپ، بہت زیادہ شرم اور احتیاط سے _____ کام لیتی ہیں، اب تو بہت دن ہو گئے ہیں _____ توفیق موٹر کا دروازہ چھوٹے ہوئے بولا۔

_____ ایں۔! یہ تم کو آج کیا ہو گیا ہے، بالکل شرمیوں جیسی باتیں کرتے ہو، بات کا سر نہ پر کیا تم کو موٹر میں بیٹھ کر دورہ پڑتا ہے _____ زمرہ نے ساڑی کا پلو پٹر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ _____

_____ دورہ تو نہیں پڑتا۔ مگر ہاں! محبت تو خود مستقل دورہ ہے

زمرہ! نادان نہ بنو، میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرو،
 اور یہاں کوئی غیر تھوڑی ہے، اور وہ (موٹر ڈرائیور کی طرف
 اشارہ کرتے ہوئے) تو موٹر چلانے میں ہمہ تن مصروف
 ہے۔ زمرہ! بالکل بے تکلف ہو جاؤ ————— تو فیق نے زمرہ کی طرف
 سر کرتے ہوئے بولا۔

————— تو فیق۔! خاموش ہو جاؤ، ایسی باتیں نہیں کیا کرتے،
 تم آج بالکل اپنے حواس میں نہیں ہو، تمہارے چہرے پر
 عجب قسم کی وحشت برس رہی ہے۔ اور —————
 زمرہ اپنی بات کو پوری طور پر کہنے بھی نہ پائی تھی، کہ اتنے میں مال گودام آگیا۔
 موٹر کی ڈرائیور نے موٹر کا دروازہ کھولا، اور دونوں موٹر سے اتر گئے۔

زمرہ تو فیق کی طرف سے کچھ کھٹک گئی تھی وہ اُس سے بچ بچ کر چلنے لگی، تو فیق
 یہی سمجھ رہا تھا کہ دوشیزگی کی شرم حایل ہے۔ یہہ ذرا جاتی رہی تو پھر میدان فتح ہے۔
 زمرہ ایک تو ویسے ہی خوبصورت تھی، اور اُس کی گھبراہٹ اور خفگی نے، اُسے نہ جانے
 کیا بنا دیا تھا، تو فیق کے سینہ میں جو ان دل تھا اور دماغ میں مستقبل کی شاندار اسکیم تھی
 انواری لڑکی محبت نے اُس کے احساس کو بہت زیادہ تیز بنا دیا تھا، اُس پر جذبات
 کا نشہ سا چھا گیا تھا، اُس نے زمرہ کے قریب آکر گھبرا کر کہا —————

————— زمرہ! دیکھو بڑا اچھا موقع ہے، چلو! یہاں سے سمندر کی طرف
 چلیں، ایسے موقعے روز روز تھوڑی ملتے ہیں —————

زمرہ نے، اس پر تو فیق کے منہ پر پوری طاقت کیساتھ جو تھپڑ رسید کیا ہے،

تو وہ چکر کھا کر رہ گیا، زمرہ کی زبان سے یہ فقرہ سن کر۔

اچھا! پولیس کو اطلاع کرتی ہوں۔

جو توفیق وہاں سے بھاگا ہے، تو بہت دور جا کر دم لیا، اور وہاں سے ٹرام میں بیٹھ کر گھر آگیا۔ محبت کا نشہ ہرن ہو چکا تھا، اور زمرہ کے پھولے ہوئے منتھنوں کیلئے رنگا ہوں، اور سلوٹوں سے بھری ہوئی پیشانی کے تصور سے توفیق گھبرا اٹھتا تھا۔ توفیق جب کئی دن تک کام پر نہیں گیا، تو اُس کے دوست نے کام پر نہ جانے کا سبب پوچھا، اُس نے دوست کے شدید اصرار پر ایک فرضی واقعہ گھر کر سنا دیا، اُس نے کہا۔ یہہ پارسی، عجب متعصب شخص ہے، روزانہ مذہبی بحث نکالا کرتا ہے، کچھ دن تک تو میں ٹالتا رہا۔ لیکن پچھلی جمعرات کو، میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں تو کمری کرتے کے لئے آیا ہوں، مذہبی بحث کرنے کے لئے نہیں۔ اُس نے پھر ایسی ہی طنز آمیز باتیں شروع کیں، مجھے بھی تاؤ آگیا، اور میں اُس کی طرف تیز ہو کر بڑھا، پارسی کے منہ پر مجھے پکڑ لیا، نہیں تو اُس مردود کا خاتمہ ہی تو کر دیتا۔

پارسی نے دفتر میں جا کر اندر سے پرچہ لکھ کر بھیج دیا کہ توفیق کو ملازمت سے برطرف کیا جاتا ہے، میں یہ حکم سن کر سیدھا مکان چلا آیا۔ اچھا ہوا، وہاں ہی پھندہ کٹ گیا، نہیں تو خدا معلوم کیا جھگڑے آکر پڑتے۔

توفیق کے دوست نے اُس کے مذہبی جوش کی بہت تعریف کی، اور اس کو بہت تسلی دئی کہ گھبراؤ نہیں، کہیں نہ کہیں تمہارا ٹھیک ہو جائے گا، جب تک میں کلکتہ میں موجود ہوں، تم کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

عبرت ناک انجیلم

توفیق کے بنگالی دوست نے اپنا کہا پورا کر دکھایا۔ ایک مہینہ تک تو توفیق بیٹھا رہا، اور اس مدت میں توفیق کے تمام اخراجات اُسی نے برداشت کئے، توفیق کا بنگالی دوست بڑا ملنسار اور خوش اخلاق تھا، بہت سے لوگوں سے اس کا میل جول تھا، اور سب لوگ اُس سے عزت کیساتھ پیش آتے تھے، اسی کی کوشش اور پیروی سے توفیق کو رومی کے کارخانہ میں جگہ مل گئی۔ اور توفیق پابندی کیساتھ اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ کلکتہ میں توفیق کے بہت سے دوست ہو گئے، اور اجاب کا یہ حلقہ رفتہ رفتہ ترقی کرنے لگا۔ توفیق کے نئے دوستوں میں مختلف طبائع کے لوگ تھے، جن کی صحبت توفیق کو ایک نئی منزل کی طرف لیجا رہی تھی۔ تھیٹر ہالوں کی سیر اور سینما بینی تو اُس کے اجاب کا معمولی مشغلہ تھا، ان میں سے بعض نوجوان تو چھٹے ہوئے بد معاش اور انتہائی آوارہ تھے۔ توفیق نے قیصر پور کی خشک، اور سادہ فضا میں پرورش پائی تھی، موٹر لاری کے ملازمین کی زبانی سُنے سُنائے قصوں کے علاوہ، اُسے شہر کی رنگینیوں کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اُس کی زندگی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اُس کی زندگی کا سب سے زیادہ رنگین واقعہ پارسی کی لڑکی زمرہ سے عشق بازی کا تھا، سو اُس عشق بازی کے افسوسناک انجام کے تصور سے، اُس کو پسینہ آتا تھا۔ اب دوستوں کی صحبت میں اُس کی بالکل نئی زندگی شروع ہوئی۔

توفیق، قیصر پور میں شعر موزوں کر لیا کرتا تھا، اُس کی آواز میں بوجھ تھا، اُس نے

۲۵
 نہایت پست اور غلط، مسلط اشعار بھی اُس کی زبان سے بھلے معلوم ہوتے تھے، کلکتہ کے دوستوں نے اُس کی اتنی بہمت افزائی کی، کہ اُس غریب کا دماغ عرش پر پہنچا دیا، اُن لوگوں نے توفیق کو باور کرا دیا تھا کہ نوجوان شعراء میں اُس کا آج جواب نہیں ہے، اور اُس کے بعض اشعار تو غالب اور متون کے شعروں سے ٹکر کھاتے ہیں۔ اُس کے دوستوں نے اُسے شراب پینے کی رغبت دلائی، توفیق شراب کے نام سے کانوں پر ہاتھ دہرتا تھا۔ اور اس گناہ کے لئے وہ کسی قیمت پر تیار نہ تھا، لیکن دوستوں کے اصرار اور اُن کے رنگین دلائل نے اُس کے زہد و معصومیت کو آخر مغلوب کر کے چھوڑا۔ شراب کے متعلق توفیق کے دوستوں نے اُس سے کہا:-

شراب اور شعر کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے، شراب پیئے بغیر تو شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ دیکھتے نہیں ہوں خیام کی رباعیوں میں کتنی مستی پائی جاتی ہے، یہ سب شراب ہی کی کرامات ہے، غالب کو جو آج ہندوستان کے تمام شاعروں پر برتری حاصل ہے، اُس کا سب سے بڑا سبب اُس کے کلام کی مستی اور تاثیر ہے، اور شراب نوشی کے بغیر کلام میں مستی اور تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتیں۔

بات یہ ہے کہ شراب پی کر دماغ پر سرور کی گھاٹیں چھا جاتی ہیں اُس ترنگ میں شاعر جو سوچتا ہے، اسی کا نام توہ الہام ہے۔ یورپ کے جتنے مضمون نگار اور ادیب ہیں، وہ شراب پی کر ہی مضمون لکھتے ہیں، شراب دل و دماغ کے خوابیدہ احساس کو پیدا کر دیتی ہے لیکن ہاں! ذرا اعتدال کی ضرورت ہے، صحت کے رکھ رکھاؤ کے لئے شراب سے بہتر کوئی ٹانک (طاقتور) آج تک تیار ہی نہیں ہوا۔

دنیا کا آدھا لطف تو شراب سے اور صرف شراب سے ہے،
 کیسا ہی صدمہ اور رنج کیوں نہ ہو، جہاں ایک پیگ چڑھایا، رنج
 و غم کی ساری بساط ہی اُلٹ گئی۔ شراب، مسرت کی خلاق اور عشرت
 و اسودگی کی پروردگار ہے۔ غم و الم کی دشمن، مسرتوں کی بھولی۔ ایک
 گھونٹ حلق سے اُترا کہ رگ و پے میں تو انانی دھڑل گئی۔

مذہب نے ہاں! اس کو ضرور برا کہا ہے، مگر اس کی اچھائیوں
 کا بھی تو اقرار کیا ہے، پھر مذہب کے تمام احکام سر آنکھوں پر، مگر اس نے
 میں مذہب کی کس بات پر عمل جو رہا ہے، تمام دنیا کسی اور ہی راستہ
 پر جا رہی ہے، 'نئے نئے مسائل و ماعوں کے سامنے آ رہے ہیں، آدمی اگر
 جھوٹ اور بُرائی سے اجتناب کرے، کسی کو دکھ نہ پہنچائے، لوگوں کو
 اخلاق سے پیش آئے، اور ان تمام اچھائیوں کیساتھ تھوڑی سی شراب
 بھی پی لے، تو اس میں ایسا کونسا ہرج ہے۔

غرض توفیق کی تمام جتنوں اور دلیلوں کو، اُس کے دوستوں نے توڑ کر رکھ دیا، اور
 اُس کو اس بات کا یقین دلادیا کہ شراب نوشی، تہذیب و تمدن میں داخل ہو چکی ہے، اور
 اس سے اجتناب کے یہ معنی ہیں کہ انکار کر نیوالا گنوار، اُڈر اور غیر مہذب ہے۔ یورپ کی تہی
 بڑی مہذب آبادی، جس حسیں کو پانی کی طرح استعمال کرتی ہو، بھلا وہ کہیں بُری اور محض صحت
 ہو سکتی ہے۔ توفیق نے آخر کار شراب پینا شروع ہی کر دیا۔ ابتدا میں تو اُس نے اعتدال
 برتا، لیکن شراب کی لذت، اعتدال و احتیاط کی حدود میں کب محصور رہ سکتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا
 کہ توفیق دھڑلے کیساتھ زیادہ سے زیادہ شراب پینے لگا، اس کی آمدنی اُس کے شوق کو پورا

کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔ توفیق نے اجاب سے قرض لینا شروع کیا۔ اب وہ اپنے بنگالی دوست کے یہاں سے چلا آیا اور نئے دوستوں کے ساتھ رہنے لگا۔

شراب کا سُرو بہت سی لذتوں کو چاہتا ہے، توفیق کے دوستوں نے ان لذتوں کو حاصل کرنے کے لئے اُس کی از خود رہنمائی کی، توفیق کو بتایا گیا کہ مغلیہ بادشاہوں کے زمانہ میں شریف لوگوں کے بچے، طوائفوں کے یہاں تربیت کے لئے بھیجے جایا کرتے تھے، طوائفوں کی صحبت میں تمیز و سلیقہ آتا ہے، تجربات میں اضافہ ہوتا ہے۔ نئے نئے کردار اور مختلف قسم کے لوا و اخلاق کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے، موسیقی رُوح میں بالیدگی پیدا کرتی ہے، اسی لئے تو بڑے بڑے صوفیوں اور مرشدوں نے موسیقی کو اپنے سلسلہ میں داخل کیا ہے۔ شراب میں موسیقی اور شعر، یہی چار چیزیں تو زندگی کو زندگی بناتی ہیں۔

توفیق دوستوں کے ساتھ طوائفوں میں جانے لگا، پہلے پہل تو اُس نے واقعی صرف ذوق سماعت و نظر کی تسکین کے لئے طوائفوں کے بالا خانوں کا طواف کیا۔ لیکن عیش و مسرت کا جذبہ ذوق و نظر کی تسکین تک اگر صرف محدود ہو کر رہ جائے تو ہمارے نوجوانوں کی اصطلاح میں اُس کو نفس کی بزدلی اور ”قوت“ کی کمی سے تعبیر کیا جائے گا۔ توفیق کی زندگی ہنایت ہی خطرناک منزل سے گذر رہی تھی، اور وہ اب ایک ایسی چٹان پر کھڑا ہوا تھا جس کے ایک طرف دھکتے ہوئے انگارے، اور دوسری طرف اتھاہ سمندر تھا۔ پہلے پہل اُس کے دل میں گناہ کرتے ہوئے جھجک اور گھبراہٹ تھی، اور تنہائی کے عالم میں وہ ایک قسم کی ندامت بھی محسوس کرتا تھا، لیکن اب وہ نڈرھیاں اور انتہائی بے باک نفس پرست انسان تھا۔ گناہ اور بد اطواری اُس کے نفس میں اس طرح شامل ہو گئی تھی، جیسے گرم پانی میں اکھل گھل مل جاتا ہے۔ توفیق سمجھتا تھا اور نہ صرف سمجھتا تھا، بلکہ اس پر یقین رکھتا تھا کہ دنیا، بس ان ہی رنگینیوں اور

ہوس کاریوں کا نام ہے، کھاؤ، پیو، عیش کرو اور جب موت آئے، مسکراتے ہوئے مرجاؤ۔ آدمی کو صرف عیش و عشرت کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے، جو زندگی عیش و مسرت سے خالی ہو اُس کو زندگی کہنا، دراصل زندگی کی توہین ہے۔

توفیق کو گھر سے آئے ہوئے ایک سال کا عرصہ ہو گیا تھا، ابتدا میں تو اُس کو گھڑاؤں کی اور خصوصاً شمشاد کی یاد آتی تھی، لیکن عیش و مسرت کی زندگی نے، اب اُس کے حافظہ سے عزیز و اقارب کی یاد اور پچھلی زندگی کے تصورات کو یکسر محو کر دیا تھا، بس اب وہ تھا، اور اُس کے تفریحی مشاغل۔ اعیاشی کی کثرت نے اُس کی صحت کو تباہ کرنا شروع کیا اور وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو گیا۔ ایک مرض ہو تو اُس کا علاج بھی ہو سکتا ہے توفیق کا جسم تو امراض کی بوٹ بن گیا تھا، اُس کے اعصاب کی توانائی، آہستہ آہستہ جو اب دیتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کو پریزکریک بہت کچھ تاکید کی، لیکن لذتوں اور مسرتوں کی چاٹ نے، پریزکریک صلاحیت ہی کب باقی رکھی تھی، ایک دو دن تو ڈاکٹروں کے کہنے سننے سے وہ پریزکریک، لیکن لذتوں کے تصورات اُس کو بھرا بھارتے، اور وہ پریزکریک دیتا، بالکل اسی طرح جیسے، ایک بچہ کھلونے کو توڑ دیتا ہے۔

جوانی کا زمانہ تھا، بہت سے امراض کے حملے تو اُس نے ہنستے کھیلنے برداشت کر لئے، لیکن گروہ کی تکلیف نے اُس کو نڈھال کر دیا۔ اب وہ چلنے پھرنے کے بھی قابل نہ رہا تھا، ایک دن مکان میں بیہوش ہو گیا، اور اُسی حالت میں، اُس کے دوست اُسے دواخانہ میں ڈال آئے۔ دواخانہ میں پھونچ کر اُسے ہوش آیا، تو وہاں کے درو دیوار کو دیکھ کر وہ گھبرائے لگا، اب وہ ایک ایسے ماحول میں تھا، جہاں کی فضا مریضوں کی کراہ، واؤں کی بو اور پکپکاریوں کی آواز سے معمور تھی۔ دواخانہ کی بعض نرسیں، یقیناً جاؤ

نظر تھیں، لیکن گروہ کا مریض جمالیات سے لطف اندوز ہونیکے قابل کہاں رہتا ہے ڈاکٹروں نے اُس کا ہمدردی کیساتھ علاج کیا مگر حملہ بہت شدید تھا اور مرض نے نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ توفیق کے دوستوں میں سے دو چار دوست ابتدا میں تو اُس کے دیکھنے کیلئے آئے، لیکن کچھ دن بعد اُن کا آنا جانا بھی بند ہو گیا۔ توفیق کو بیماری میں اپنے بنگالی دوست کی یاد آئی، اُس نے بڑی خوشامد کے بعد دوا خانہ کے چہر اسی کے ہاتھ دوست کے پاس خط بھیجا۔ چہر اسی نے واپس آکر کہا کہ وہ صاحب، ایک مہینہ سے اپنے وطن گئے ہوئے ہیں۔ توفیق کی تکلیف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، عیش و لذت کے تصورات اب اُس کے لئے سوہان روح کا باعث تھے ایسے میں اُسے اپنے عزیزوں اور خصوصاً شمشاد کی یاد آئی، اُس نے شمشاد کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط لکھا :-

پیارے شمشاد۔ !

تم مجھ پر بے مروتی کا الزام لگا سکتے ہو، کہ میں تم کو بیمار چھوڑ چلا آیا۔ اور آنے کے بعد تم کو ایک خط بھی نہ لکھا، میں یقیناً خطا وار ہو، مگر اب اس داستان کے دہرائے کا زمانہ نہیں رہا۔ مجھے کچھ کہے سُننے بغیر اپنے قصور کا اعتراف ہے۔ میں اتنے دن کہاں رہا، کس طرح رہا، یہ تفصیلات بڑی ہی دردناک ہیں، جب تم سے ملاقات ہوگی تو مفصل عرض کروں گا۔ اب تو میں یہاں کے بڑے دوا خانہ میں پڑا ہوا موت کا انتظار کر رہا ہوں، دنیا میں میرے لئے اب کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی، آہ دنیا کی ستر میں کس درجہ فانی اور عارضی ہیں ہر شے میں نے ایک خواب دیکھا تھا، بہت ہی مختصر خواب، اُسکی تعبیر یہاں

دواخانہ میں دیکھ رہا ہوں۔

میرے والد کو میرا یہ خط تم چاہو تو دکھا سکتے ہو، تم سے ملنے کو طبیعت چاہتی ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ملنے کے لئے غالباً نہ آسکو گے۔

دل بہت کچھ لکھنے کے لئے چاہتا ہے، مگر اتنی سطریں لکھنے میں سر ہرچرا گیا، سانس اکھڑ گئی، مجبوراً تم سے رخصت ہوتا ہوں۔
شمشاد! خدا حافظ۔!

تمہارا نالائق دوست

توفیق

توفیق کے وطن سے چلے جانیکے بعد، اُس کے والدین اور عزیز و اقارب نے بہت کچھ اُس کی تلاش کی، لیکن توفیق کا پتہ نہ چل سکا، شمشاد کو بھی عزیز دوست کی اچانک جدائی کا بہت افسوس ہوا، اور اُس نے بھی جہاں تک اُس سے ممکن ہو سکا، توفیق کی جستجو کی، اُن لوگوں کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ توفیق، کلکتہ پہنچ کر ایسی زندگی اختیار کر سکتا ہے، جس میں شراب نوشی اور اُس کے تمام مکروہ لوازم داخل ہیں۔ توفیق کے خط کو پڑھ کر، شمشاد کو دوست کے یکایک پتہ لگ جانے بڑی مسرت ہوئی، لیکن پردیس میں اُس کی کس مہر سی اور بیماری کا حال پڑھ کر بہت افسوس ہوا، شمشاد، توفیق کا خط لیکر توفیق کے گھر گیا، سب لوگوں کو شمشاد کی طرح، توفیق کے پتہ لگ جانے کی خوشی اور بیماری کی خبر سے فکر ہوئی۔

شمشاد کے والد ایک ہفتہ سے بیمار تھے، بخار تو اتر گیا تھا، مگر کمزوری زیادہ تھی

بوڑھے آدمی کو بیماری نے اور زیادہ چڑچڑا بنا دیا تھا۔ شمشاد نے جب باپ سے کلکتہ جانے کی اجازت چاہی، تو وہ بہت زیادہ بگڑے، لگے، شمشاد نے جیسے تیسے بھائی بھائی باپ کو راضی کیا۔ اور توفیق کے باپ کے ہمراہ کلکتہ کو روانہ ہو گیا۔ تیسرے دن وہ دو کلکتہ پہنچ گئے، اسٹیشن سے اتر کر قریب کے ہوٹل میں اسباب رکھا، اور سیدھے دواخانہ پہنچے۔ توفیق اپنے خط میں وارڈ اور کمرے کا نمبر لکھنا بھول گیا تھا، کلکتہ کا بڑا دواخانہ چھوٹی موٹی دینا ہے، بڑی مشکل سے توفیق کا پتہ چلا۔ لیکن مصیبت یہہ ہوئی۔ کہ مریضوں سے ملنے کا وقت ختم ہو چکا تھا، اور شمشاد اور توفیق کے باپ شیخ غلام علی کو توفیق کے وارڈ کے پہلے دروازہ پر روک دیا گیا۔ شمشاد نے ڈاکٹروں سے کہا۔

یہہ صحیح ہے کہ دواخانہ کے قانون و ضابطہ کے مطابق اب باپ کو، مریضوں سے نہیں مل سکتے، مگر دنیا کے ہر قانون میں کچھ نہ کچھ مستثنیات ضرور ہوتے ہیں، ہمارا عزیز آپ ہی لوگوں کے بقول بہت زیادہ بیمار ہے، پھر پورے ایک سال کے بعد اس کا پتہ لگا ہے۔ آپ اس مریض کے بوڑھے باپ کی حالت نہیں دیکھتے ہیں، کہ بیٹے سے ملنے کیلئے وہ کس قدر بے تاب ہیں، ہم ایک ہزار میل کا سفر کر کے آئے ہیں، ایسی صورت میں خدا کے لئے توفیق سے ہم کو مل لینے دیجئے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ ہمارے ملنے ملانے میں دو تین منٹ سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا۔

مگر جس دنیا میں قانون و ضابطہ کی صرف حکومت ہو، وہاں ایک پریشان حال انسان کی کون سُننا تھا، شام کے پانچ بجے تک دونوں کو انتظار کرنا پڑا۔ اور شام کو

بڑی بے تابی کیساتھ دونوں، توفیق کے کمرے میں پہنچے۔ توفیق کا آپریشن ہوئے، آج دوسرا دن تھا، اُس کی مکر پر بہت سی پیٹیاں بندھی ہوئی تھیں، اور وہ معمولی حرکت کر نیکی بھی قابل نہ تھا۔ بوڑھے باپ، اور عزیز دوست کو دیکھ کر، اُس کے لاغراور زرد چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی اُسی عالم میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے، خساروں پر دھلک کر رہ گئے، باپ بیٹے کے ہونٹ چومنے کے بغیر اُترتے کھڑے ہوئے ڈاکٹر نے بوڑھے کو پکڑ لیا۔

یہ کیا کرتے ہو، مریض ہلنے جلنے کے قابل نہیں ہے، اور پھر ایسے

مریض کے منہ کی بھاپ سے تو دور رہنا چاہیئے۔

ڈاکٹر نے قدرے تن کر جواب دیا۔ توفیق کچھ کہنا چاہتا تھا، اور اُس کے ہونٹوں کو ذرا جنبش بھی ہوئی، لیکن ناتوانی کا بُرا ہوا کہ اتنی ذرا سی جنبش میں اُس کو چکر آگیا اب وہ بالکل غافل تھا۔ شیخ جی اور شمشاد کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب! میرے بچے کو کیا ہو گیا، کچھ فرمائیے۔ توہمی

شیخ جی نے پکپکاتے

ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

اس مریض کے گردے خراب ہو گئے ہیں، کل اس کے

گردوں کا آپریشن ہوا ہے، کمزوری بہت بڑھ گئی ہے،

کل سے کئی دفعہ غشی طاری ہو چکی ہے۔ کوئی ایک مہینہ

اچھے ہونے میں لگیگا۔ آج تو دوسرا ہی دن ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

ڈاکٹر صاحب! تو میرا بچہ ضرور اچھا ہو جائے گا

آپ کو یقین ہے ————— شیخ جی نے ڈاکٹر کو محبت کی نظروں سے دیکھتے ہوئے

پوچھا۔

ہاں! آپریشن تو کامیاب ہوا ہے، مگر مرض ابھی
خطرہ سے باہر نہیں ہوا، پانچ دن گزر جائیکے بعد یقینی طور
پر کوئی بات کہی جاسکتی ہے، بڑا نازک آپریشن تھا۔
اچھا، اب تم لوگ یہاں ایک منٹ بھی نہیں بیٹھ سکتے،
ڈاکٹر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ شمشاد اور توفیق کے باپ غلام علی کو مجبوراً
وہاں سے چلا آنا پڑا۔

توفیق کو غش پر غش آرہے تھے۔ رات میں اس کی حالت
بہت زیادہ نازک ہو گئی، ڈاکٹر نے قوت پھونچانے کے لئے ہلکا سا
انجکشن بھی دیا، مگر اب مصنوعی ذریعے سے قوت پھونچانے کا وقت
گزر چکا تھا۔ رات کے ڈیڑھ بجے، توفیق نے چیخ ماری۔

”اباجان! شمشاد! میں چلا“

”اچھا! آخری سلام۔!“

ڈاکٹر نے نبضوں پر ہاتھ رکھا، تو توفیق ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ ادھر توفیق نے
آخری ہچکی لی، اور ادھر توفیق کے باپ شیخ غلام علی جن کی ابھی ابھی بڑی مشکل سے
آنکھ لگی تھی، ایک گہرا کرچونک پڑے، اور شمشاد کو نیند سے جگا کہنے لگے۔
شمشاد! میں نے خواب دیکھا ہے، کہ توفیق مجھے اور تمہیں

سلام کر رہا ہے، اس انداز سے، جیسے وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہے اور ہاں! میں نے اس کو کفن میں لپٹا ہوا دیکھا ہے، شمشاد! میرا دل بیٹھا جاتا ہے، کسی طرح نہیں سنبھلتا۔ ہائیں! میرا بچہ۔!

شمشاد نے شیخ جی کو بہت کچھ تسلی دی مگر شیخ جی کی آنکھوں سے آنسو ایکس منٹ منٹ کے لئے بھی نہ تھمے، دونوں کی رات یوں ہماروتے دھوتے بسر ہوئی، صبح کو دونوں دواخانہ پہنچے، اور وہاں پھونچتے ہی، یہہ روح فرسا خبر ملی کہ توفیق رات کے ایک بجے مر گیا، شیخ جی تو کمر پڑ کر بیٹھ گئے، توفیق کو بھی عزیز دوست کی موت کی خبر نے حیرت و غم کی تصویر بنا دیا۔

دواخانہ کی طرف سے توفیق کے کفن و دفن کا سامان ہوا، محب توفیق کا جنازہ قبر میں اتارا جائے لگا ہے، تو شیخ جی دھڑام سے زمین پر گر پڑے، شمشاد نے شیخ جی کو اٹھایا۔ وہ خود فرط غم اور شدتِ الم سے نڈھال ہو رہا تھا، آخر کار دونوں نے توفیق کی قبر پر پتھر آتے ہاتھوں سے مٹی ڈالی، اور جس کو لینے کے لئے وہ یہاں کلکتہ میں آئے تھے، اُس کو سپرد خاک کر کے، خالی ہاتھ واپس گئے۔

شمشاد اور توفیق کے باپ شیخ غلام علی قیصر پور پھونچے، اور جب توفیق کے گھر والوں کو توفیق کی موت کا حال معلوم ہوا، تو سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ یہاں تو لوگ توفیق کی آمد آمد کی خوشیاں منا رہے تھے، توفیق کی بوڑھی ماں نے میلاد شریف کے لئے، حلوائی کو مٹھائی کا آرڈر دیدیا تھا، شیخ جی کے گھر کی صفائی ہو رہی تھی۔ توفیق کی موت کی خبر نے خوشی اور رت کی بساط ہی الٹ دی، جو گھر ابھی تھوڑی دیر پہلے قہقہوں سے گونج رہا تھا، یکایک اُسکی فضا گریہ و یکساںے معمور ہو گئی۔

دفتر کی زندگی

توفیق کی موت نے شمشاد کو بید متاثر کیا۔ توفیق اور شمشاد بچپن کے ساتھی تھے، اسکول کی زندگی بھی ساتھ ہی گزری، جتنے دن توفیق، کلکتہ میں رہا، بس اتنے ہی دن دونوں میں جدائی رہی، شمشاد اپنی زندگی میں غیر معمولی کمی محسوس کر رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اُس کی زندگی کے بنے بنائے خاکہ کو بے ترتیب بنا دیا۔ دن گزرنے لگے، اور اُس کے غم میں بھی کمی ہوتی گئی۔ توفیق کی جدائی کے نقوش مٹنے والے تو نہ تھے۔ مگر ہاں، دنیا کی مصروفیت اور زمانہ کے مشاغل نے اُن کو دھندلا ضرور بنا دیا تھا۔

شمشاد نے ایک سال کے بعد میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی، وہ اپنی تعلیم کو جاری رکھنا چاہتا تھا، لیکن اُس کے باپ نے ملازمت کے لئے مجبور کیا۔ اور اُسے کلکٹر میں ایک جگہ مل گئی۔ دفتر میں پھونچ کر شمشاد کو بالکل ایک نئی دنیا سے سابقہ پڑا، اور یہ نئی دنیا اُس کے لئے نہ صرف نئی تھی، بلکہ اس کی خود داری اور اُس کے کیرئیر کی عظمت یا لکل منافی تھی۔ اُس نے کلکٹری کے دفتر میں جا کر دیکھا کہ کوئی ڈپٹی کلکٹر جب دفتر کے برآمدے سے گذرتا ہے، تو دفتر کے کلرک اس طرح جھک کر آداب بجالاتے ہیں، گویا یہ لوگ غنقریب سجدے میں گر نیوالے ہیں۔ مندر میں کوئی برہمن بھی شاید اس عقیدت کیساتھ مہادیو کے سامنے ڈنڈو نہ کرتا ہوگا۔

کسی عہدیدار نے کسی اہلکار (کلرک) کے بلانے کے لئے چپراسی کو بھیجا، اُدھر چپراسی

کے منہ سے دو بول نکلے، اور ادھر اہلکار۔ اس طرح گھبرا کر دوڑا، جیسے کہ عرش سے سچے سچ وحی نازل ہوئی ہے، اور اگر ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو گئی تو جان اور ایمان دونوں کی خیر نہیں دفتر کے ملازمین عہدیداروں سے اس قدر فروتنی، عقیدت، انکسار اور خوف کیساتھ ملنے لگے، گویا کہ ان لوگوں کی قسمت کے یہ عہدیدار ہی مالک ہیں، اور ان کے رزق کی کنجی ان ہی حاکموں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لوگ عہدیداروں کو خدا تو نہ سمجھتے تھے، مگر ایک انسان خدا کی جتنی عظمت کر سکتا ہے، اور خدا سے جس قدر ڈر سکتا ہے۔ اُس سے کچھ زیادہ ہی عہدیداروں کی عظمت کیجاتی تھی، اور ان سے ڈرا جاتا ہے۔

دفتر کے اہلکار دفتر کی کارروائیوں میں عہدیداروں کے ناموں کیساتھ بڑے بڑے انقلاب لکھتے تھے، اور رخصت اور ترقی وغیرہ کی درخواستوں میں تو ان عہدیداروں کو ”خداوند نعمت“ فیض بخش فیض رساں، حاتم دوراں، دام اقبالکم“ اور نہ جانے کیا کیا لکھا جاتا تھا۔ اور یہ اہلکار اپنے کو ”فرمانبردار، خاکسار، کمترین“ لکھتے تھے، دفتر کی کارروائی میں، اہلکاروں کی طرف سے، اس انداز میں گزارشیں اور یادداشتیں پیش ہوتی تھیں۔ گویا یہ لوگ اپنے لئے عہدیداروں سے گڑ گڑا کر بھیک مانگ رہے ہیں۔ دفتر کی تمام امثال نیازمندی اور عقیدت کے ان ہی بے پناہ مظاہروں سے بھری پڑی تھیں، اور اسی خاکسار فروتنی خود ناشناسی اور ذلت نفس کا نام ”ڈسپلن“ تھا۔ کس کی مجال تھی، جو اس ”ڈسپلن“ کے خلاف، ایک حرف بھی منہ سے نکال سکے۔

دفتر کی زندگی کو دیکھ کر، شمشاد نے بڑا دکھ محسوس کیا۔ دفتر کیا تھا، چھا خاصہ بہت کڑ تھا، جہاں بہت سے مہذب، بھاری، بٹوں کی پوجا کرتے تھے۔ ملازمین نے اپنے ضمیروں اور ایمانوں کو، بہت ہی سستے داموں پر بیچ دیا تھا۔ انسانیت کی عظمت، پناہ ڈھونڈ

تھی، اور اس کو کوئی پناہ دینے والا بھی نہ تھا۔ گرمی کے زمانہ میں عہدیداروں کے کمروں کا دروازہ
 پر خس کی ٹیٹیاں لگائی جاتیں پھر اسی ان پر پانی چھڑکتے، اور مزدور پنکھا کھینچتے، لیکن اہلکاروں
 کے کمرے گرم ہوا کے تھپڑوں کے لئے وقف تھے، وہاں نہ تو خس کی ٹیٹیاں تھیں، نہ پنکھے تھے،
 یہ لوگ دن بھر گرم ہواؤں میں جھلستے، اور حیرت تو اس پر ہے کہ اس حالت میں وہ لوگ
 مطمئن اور خوش و خرم تھے، ان لوگوں کا نفس اتنا ذلیل ہو گیا تھا، کہ انھوں نے خود بخود
 فرض کر لیا تھا، کہ ان کیساتھ ایسا سلوک ہونا ہی چاہیے، اور اس امتیاز سے، ان کی عزت
 میں کوئی فرق نہیں آتا، ان کی خودداری ذرہ برابر متاثر نہیں ہوتی۔

اہلکاروں کی زندگی، بالکل چوپایوں کی زندگی تھی، اور یہ سب کچھ اہلکاروں کا
 ہی کیا دھرا تھا، ان ہی نے اپنے کو اس قدر ذلیل اور کمینہ بنا لیا تھا، ورنہ اگر وہ لوگ ذرا
 بھی خودداری اور عظمتِ نفس سے کام لیتے تو عہدیداروں کو خدائی مکر نے کا موقعہ ہی نہ ملتا۔
 ان ہی لکڑیوں نے خوشامد اور تعریف کر کے، عہدیداروں کو عرش سے بھی کچھ اوپر بٹھا
 تھا۔ ایک مرتبہ ایک عہدیدار کی ترقی ہوئی، اُس کی ترقی کی خوشی میں، دفتر والوں کی
 طرف سے شاندار پارٹی دی گئی، دفتر کے ملازمین نے عہدیدار کی تعریف میں جو قصیدے پڑھے
 ہیں اور تقریریں کی ہیں، ان کا خلاصہ یہ تھا کہ :-

آپ عدل و انصاف میں رشکِ نوشیرواں، جو دو سخاوت
 میں غیرتِ حاتم، بہادری اور دلیری میں رستمِ ثانی ہیں۔ اپنے ماتحتوں
 پر ماں باپ سے زیادہ مہربان ہیں، فراست و تدبیر میں افلاطون و
 بقراط کے جانشین اور علم و کمال میں بوعلی سینا اور بزرگوارِ دشا کی
 مثال ہیں۔

ان عہدیدار صاحب کا چہرہ اُلٹے تو لے کی طرح کالا تھا، اُس پر چھپکے گہرے داغ تھے، ایک صاحب نے قصیدے میں اُن کے حُسن پر جو تبصرہ کیا ہے، اُس کا خلاصہ نثر میں پیش کیا جاتا ہے :-

آپ کا چہرہ آفتاب اور ماہتاب کو شرماتا ہے، خدا نے حُسنِ سیرت کیساتھ آپ کو حُسنِ صورت بھی عطا فرمایا ہے، آپ یوسفِ ثانی ہیں۔ آپ مُسکراتے ہیں تو بھلیاں کو ندے لگتی ہیں۔

یہی عہدیدار صاحب، ہنایت ہی غریب گھرنے کے تھے، اُن کا باپ سُنتے ہیں کہ گورنر کے یہاں خانساں تھا، سفارشوں کی بناء پر ان کو عہدہ مل گیا۔ ان کو خاندانی حالات کا بھی، ایک صاحب نے اپنی تقریر میں ذکر فرمایا :-

حضرات ! ہمارے مدوح، خدا کے فضل سے خاندانی عورت

و دجاہت کے مالک ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب شیر شاہ سوری تک پھونچتا ہے، سنا ہے کہ آپ کے جدِ امجد، شاہِ عالم کے زمانہ میں، قضاۃ تھے، آپ کے خاندان کو سلطنتِ مغلیہ کی طرف سے جاگیر عطا ہوئی تھی

جو قدر کے زمانہ میں چھپ گئی۔ حکومت کو ایسے خاندانی امیر اور صاحبِ جاہ و عظمت انسان کی قدر کرنی ہی چاہیے تھی۔

شمشاد ان باتوں کو دیکھ کر جی ہی جی میں گرہ ہتا تھا۔ اور یہہ زندگی اُس کیلئے رُوحِ فرسا اور تکلیف دہ تھی وہ عہدیداروں کے پاس جانیسے گریز کرتا تھا، جب کئی گریزِ ضرورت کی بناء پر کسی عہدیدار کا سامنا ہو جاتا، تو وہ ایک شریف اور خوددار انسان کی طرح سلام کر لیتا۔ شمشاد تو عہدیداروں کے ناموں کیساتھ القاب و آداب کے دُم چھلے لگاتا تھا

اور نہ اپنے نام کا "کمترین" خاکسار، فرمانبردارِ خلوم کیساتھ بیوند جوڑتا تھا،
 ایک مرتبہ شمشاد نے رخصت کی درخواست پیش کی، جس میں از متعلقہ کو صرف
 "تجربہ اور صاحب" کے القاب سے یاد کیا، اور اپنا نام بغیر "کمترین" اور خاکسار کے ذیل
 دُم چھلے کے لکھا۔ درخواستِ قاعلہ کے مطابق صیغہ کے منتظم (آفس سپرنٹنڈنٹ) کے سامنے
 پیش ہوئی، اس نئی قسم کی درخواست کو دیکھ کر منتظم نے شمشاد کو چہرہ اسی بھیج کر بلایا۔

یہہ آپ ہی کی درخواست ہے کیا۔ ۹۔ منتظم نے عینک، ناک
 کی نوک پر رکھتے ہوئے کہا۔

جی ہاں! یہہ میری ہی درخواست ہے۔ شمشاد نے گرسی پر بیٹھے
 ہوئے جواب دیا۔

مانا کہ آپ نے نئے ملازم ہوئے ہیں، اور دفتر کے آداب کو واقف
 نہیں ہیں، مگر آپ دوسرے لوگوں سے پوچھ کر درخواست
 لکھ سکتے تھے، دفتری کارروائیوں میں تو دوسرے لوگوں سے
 پوچھ بغیر کام ہی نہیں چل سکتا۔ نئے آدمی پرانے آدمیوں سے
 پوچھ کر ہی کام سے واقف ہوتے ہیں۔ منتظم نیسل گھماتے ہوئے
 بولا۔

میں تو ہمیشہ اپنے ساتھیوں سے جب کوئی بات سمجھ میں نہیں
 آتی تو پوچھ لیتا ہوں، لیکن درخواست کی معمولی سی عبارت
 کے لئے کسی سے پوچھنے گھمنے کی کیا ضرورت تھی۔ شمشاد نے جواب دیا۔
 تو آپ اپنے متعلق حسن ظن بھی رکھتے ہیں۔ سبحان اللہ!

چشم بد دور! جناب مولوی صاحب قبلہ! اگر یہہ درخواست
میں یوں ہی افستعلقہ کے پاس بھیجتا تو میری اور آپ کی
دونوں کی شامت آجاتی۔ آپ کو تو دفتر میں آئے ہوئے۔
جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے، لیکن میری تو پورے بیس سال
کی ملازمت پر حرف آجاتا۔ _____ منظم قدرے سختی کیسا
تھا
بولا۔

آخر معلوم بھی ہو تو کہ میری لکھی ہوئی درخواست میں کیا خرابی
رہ گئی ہیں؟ _____ شمشاد نے انتہائی
سادگی کیساتھ کہا۔

بڑے بڑے نادانوں سے اس دنیا میں سابقہ پڑتا ہے، اے
میاں! آپ نے درخواست تھوڑی لکھی ہے، بلکہ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ جیسے کوئی عہدیدار اپنے برابر کے عہدیدار کو کوئی
یادداشت لکھ رہا ہے۔
(منظم درخواستوں کی فائل شمشاد کے سامنے رکھ دیتا ہے)
یہ دیکھو! درخواستیں اسی طرح لکھی جاتی ہیں۔ عبارت کا انداز
اور محاطت کا یہ طریقہ ہے۔ _____ منظم شمشاد کی طرف
غور سے دیکھتے ہوئے
بولا۔

اس پر شمشاد نے دو چار درخواستوں کو غور سے پڑھا۔ وہ ابھی مطالعہ میں مصروف

ہی تھا کہ آفس سپرنٹنڈنٹ (منظم) نے کرسی سے قدرے اٹھتے ہوئے کہا:-

پڑھ چکے درخواستیں! سمجھ گئے، دفتری آداب! جاو اس
درخواست کو چاک کر ڈالو، دوسری درخواست لکھ کر لاؤ۔ اور ہاں!
دیکھنا، ذرا ہاتھ روک کر لکھنا، حاکم لوگ ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہیں۔
ہم کو اپنی طرف سے ایسا موقع ہی نہ دینا چاہیے کہ حکام کو کچھ کہنے سننے کی
ضرورت پڑے۔

شمشاد نے۔ درخواستوں کی مثل ————— الٹ کر رکھ دی، اور منظم کو
مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

جی ہاں! درخواستیں پڑھ چکا، مگر میں دنیا میں کسی انسان کو
بھی خداوند نعمتؑ لکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اور نہ میں محض
دنیوی جاہ و عزت کے اعتبار سے، دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں اپنی
کمترین اور خاکسار، سمجھتا ہوں۔

شمشاد کے جواب پر، منظم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، اُس نے کسی اہلکار سے لے کر
اس قسم کا جواب سنا ہی نہ تھا۔ اُس نے قدرے گھبراہٹ کیساتھ کہا:-

آپ نوکری کرنے آئے ہیں، یا بادشاہت کرنے کے لئے آئے
ہیں۔ دفتری آداب کی پابندی آپ کو کرنی چاہیئے۔ جب آپ گھر
سے نوکری کرنے کے لئے نکلے ہیں، تو اپنے سے بڑوں کا ادب بھی کرنا
پڑیگا۔ اور خود کو چھوٹا سمجھنا ہوگا۔

شمشاد، منظم کے اس جواب پر مسکرایا، وہ تھوڑی دیر تک کھانستارہا، اُس کے بعد

جی ہاں ! میں نوکری کرنے کے لئے ہی آیا ہوں، بادشاہت کرنے کے لئے نہیں آیا۔ لیکن نوکری کے معنی غلامی کے نہیں ہیں، میں نے ملازم ہو کر اپنے ضمیر اور خودداری کو فروخت نہیں کر دیا۔

اپنے عہدیداروں کو میں جناب اور صاحب لکھتا ہوں، او جہاں تک دفتری کام اور اس کے فرائض کا تعلق ہے، میں نے اب تک کوتاہی نہیں کی۔ اور میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے کسی عہدیدار کے ادب کو نہیں گھٹایا۔
اس پر منتظم نے کہا :-

آپ تو بڑے سرکش معلوم ہوتے ہیں، آپ کے خیالات تو بالکل اشتراکی جیسے ہیں، کیا روس کا سفر کیا ہے آپ نے؟
شمشاد نے ٹوپی کا پھندنا گھماتے ہوئے جواب دیا :-

خودداری کا نام سرکشی نہیں ہے۔ منتظم صاحب معاف فرمائیے
آپ نے سرکشی اور خودداری کو سمجھنے کی غالباً کوشش نہیں فرمائی۔

میں نے نہ تو روس کا سفر کیا ہے، اور نہ میں اشتراکی خیال رکھتا ہوں، میں نے صرف اخباروں میں یہ لفظ پڑھا۔ مجھے اشتراکی دستور اور روس کی موجودہ حکومت کا ذرا بھی علم نہیں ہے، لیکن خودداری کا احساس اور اپنی آپ عزت کرنا، تو ہر انسان کی فطرت اور جبلت میں داخل ہے۔ اگر آپ اس کو اشتراکیت سمجھتے ہیں تو یہہ ہی سمجھ لیجئے۔

الفاظ کے اُلٹ پھیر سے حقیقت تو نہیں بدلتی۔

شمشاد کی باتوں سے منظم کو بھی حیرت ہو رہی تھی اور اُس کے چہرے پر حنفی اور عتاب کے آثار بھی پیدا ہوتے جا رہے تھے۔

تو پھر آپ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ اس درخواست کو نہیں بدلیں گے۔ منظم پیشانی کی سلوٹ انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

جی ہاں! یہ میرا قابلِ تبدیل فیصلہ ہے، میں اس درخواست میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ شمشاد نے جواب دیا۔
دیکھئے! میں آپ کو پھر سمجھاتا ہوں، جوانی کے زور میں لگی ہوئی نوکری پر لات نہ ماریئے، بہت بُرا زمانہ ہے بی۔ اے۔ ایم۔ اے نوکری کے لئے در بدر مارے مارے پھر ہیں، اس لگے ہوئے روزگار کی قدر کیجئے۔

صاحب! بہت تیز مزاج ہیں، آپ کی باتوں کی خبر ہو گئی تو فوراً بر طرف کر دیں گے۔ منظم نے قدرے ظالم لہجہ میں کہا۔

آپ کی ہمدردی اور بزرگانہ شفقت کا بہت بہت شکریہ! لیکن میں آپ کے ”صاحب“ کو رازق نہیں سمجھتا، جو خدا آپ کو اور آپ کے ”صاحب“ کو کھاتے کو دیتا ہے، وہی میرے کھانے کا نہ صرف کفیل ہے، بلکہ مجھے

للمصنف

پیدا کر نیسے پہلے اُس نے اپنے آپ کو میرے رزق کا ذمہ دار بنایا۔
ہے، میں جہاں بھی رہوں گا، مجھے میری قسمت کا ضرور ملیگا۔

میں تو ملازمت کو نہیں ٹھکرا رہا ہوں، لیکن ملازمت اگر
ذلتِ نفس اور ضمیر کی غلامی کا نام ہے، تو ایسی تو کُری سے فاقے کرنا
بھلا! دنیا میں کوئی شخص خود داری کی قسمت ادا نہیں کر سکتا جب
یہہ جو ہر باقی نہ رہے تو پھر انسان اور کتے میں کیا فرق ہے۔ اور میں
چند ٹکڑوں کے لئے ٹکٹا بننا پسند نہیں کرتا۔۔۔۔۔ شمشاد نے ایک ایک
لفظ کو آہستہ آہستہ ادا کیا۔

مشر شمشاد! آپ بالکل بغاوت پر اتر آئے
ہیں، اور بڑی نا سنجھی کی باتیں کر رہے ہیں۔ اس دفتر میں
کلرکوں کی تعداد پچاس سے اوپر ہی ہو گئی، کیا آپ کے
خیال میں یہہ سب کے سب ذلیل اور ضمیر فروش ہیں۔
میاں! آدمی کو چاہیئے کہ جس جگہ جائے گھل مل کر رہے۔۔۔ منتظم قلم سے کان کھجلا
ہوئے بولا۔

بات تو میں بہت سمجھ کی کر رہا ہوں، مگر اس کو
کیا کیا جائے، کہ آپ نے جس ماحول میں اپنی زندگی کے
بیس سال گزارے ہیں، اُس سے آپ ایک قدم باہر
آنا نہیں چاہتے۔

اگر اس دفتر کے سب کے سب اہلکار یہاں کے

عہدیداروں کو خداوند نعمت، ان داتا اور اپنی قسمتوں
کا مالک سمجھتے ہیں، تو آپ خود ہی انصاف سے بتائیے کہ
ان لوگوں کو کیا کہا جائے گا؟ میں ان لوگوں میں سے نہیں
ہوں جو:-

”زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ساز“

پر عقیدہ رکھتے ہیں، میرا تو یہہ ایمان ہے:-

گفتند جہان ما، آیا تو می سازد

گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ بر ہم زن

لوگ کہتے ہیں کہ ”جیسا دیں ویسا بھیس“ میں

کہتا ہوں کہ اگر دیں اچھلے تو اس کا بھیس ضرور اختیار

کر لینا چاہیے اور اگر دیں بُرائے تو اس دیں کے بھیس کو

اگر پارہ پارہ کر کے کی ہمت نہ ہو تو کم سے کم اُسکے پہننے سے

گریز کرنا چاہیئے منظم صاحب از ندگی کھانے پینے پہننے

اور لکھنے پڑھنے کا نام نہیں ہے۔ زندگی صرف عظمتِ کردار

اور آزادیِ ضمیر کا نام ہے، یہہ چیز چلی گئی تو بس سمجھ لو کہ

آدمی مر گیا۔ اب اُسکی مثال پتھر کے ٹکڑے کی ہے کہ

ہر چلنے والا اپنی ٹھوکر سے اُسے جہاں چلے پھینک دیتا ہے۔ شمشاد نے مینر پر

کہنی ٹیکتے ہوئے جواب

دیا۔

اچھا۔ ! معلوم ہوا، آپ اپنی تباہی کے درپے

ہیں خیر۔ ! جا بیٹے، اپنے کمرے میں جا بیٹے، زیادہ نصیحت

کرنے کی ضرورت نہیں۔

منتظم بہ جُملے دہراتے ہوئے، کاغذ پر پنسل سے لکیریں کھینچنے لگا، اور شمشاد وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

ذرا سی دیر میں، یہہ خبز بجلی کی طرح سارے دفتر میں دوڑ گئی اور بعض خوشامد نے متعلقہ عہدیدار تک اس خبر کو خوب نمک مرچ لگا کر پھونچا دیا، عہدیدار نے آفس سپرنٹنڈنٹ کو بلا دیا۔ منتظم نے عہدیدار کے دریافت کرنے پر، اپنی اور شمشاد کی ساری گفتگو دہرا دی۔ شمشاد کی لکھی ہوئی درخواست بھی عہدیدار نے عتاب و اشتباہ کی نظروں سے دیکھی۔ حاکم نے دفتر کے بعض لوگوں سے شمشاد کے متعلق دریافت کیا تو ان خوشامدیوں نے غریب شمشاد کی مخالفت میں دفتر کے دفتر بیان کر ڈالے، انہوں نے کہا:-

خداوند نعمت۔ ! اس لڑکے کو روٹیاں لگ گئی ہیں، اپنے گوملکی لاٹ کا

بھی باوا سمجھتا ہے۔ پرسوں چھوٹے ڈپٹی صاحب کو اس نے میرے سامنے اس طرح سلام کیا، جیسے ڈپٹی صاحب اس کے لنگوٹیاں رہیں۔

حضور والا! یہہ لونڈا تو دفتر کے کلرکوں سے کسی دن اسٹر ایک یا سیناگرہ

کرا کے رہیگا، اور کیا عجب ہے کہ سب کو بغاوت پر آمادہ کر دے۔ روزانہ لیکچر دیا

کرتا ہے کہ سب انسان برابر ہیں، مال دولت اور عہدے سے کوئی انسان، کسی سے

بڑھ نہیں جاتا۔ جس شخص کے اخلاق اچھے ہیں۔ اور جو خدا ترس اور راست باز

وہی خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا ہے۔

اور ہاں سرکار! کوئی ایک ہفتہ ہوا تو یہہ شمشاد ایک تاریخ کی کتاب لیکر آیا تھا جس میں سے اُس نے پڑھ کر سنایا کہ شکستہ حال مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں دندناتے چلے گئے، اور ایک پھٹے حال اعرابی نے حضرت عمر فاروق کا گریبان تھام لیا۔

تو حضور —! ان باتوں سے اُس کا یہی مقصد ہے کہ دفتر کے لوگ، عہدیداروں کے ادب آداب میں کمی کر دیں، اور اُن سے جھجک کر نہ ملیں، اُن کے مقابلہ میں اپنے کو کم نہ سمجھیں۔
سرکار عالی جاہ! ایک دن تو یہہ شمشاد کہہ رہا تھا، کہ انسان کو صرف خدا سے ڈرنا چاہیئے، بندوں کا ڈر اور خدا کا ڈر ایک دوسرے نہیں سما سکتے۔

اور ہاں! بات بات پر تو یہہ کل کو نڈا قرآن کی آیتیں، حدیثیں اور بزرگوں کے قول پیش کرتا ہے۔

خداوند نعمت! یہہ چھوکر اسارے دفتر کو خراب کر کے چھوڑ گیا۔ ایک دن کہہ رہا تھا کہ آپ کی گرمیوں سے پہلے دفتر کے کلروں کو در خواست دینی چاہیئے کہ اُن کے کمروں کے دروازوں پر بھی خس کی ٹٹیاں لگائی جائیں، یہہ تو ہر بات میں معززہ عہدیداروں کی برابری کرنا چاہتا تھا، اور سرکار! یہہ اگر کچھ دن اور دفتر میں رہ گیا، تو دفتر کے دلیل چپراسی، اہلکاروں کی برابری کرنے لگیں گے عید

کے بعد جو دفتر کھلا، تو یہہ شمشاد ایک ایک چپراسی سے گلے ملا،
 بڑی گرمجوشی اور تپاک کیساتھ، جیسے کہ یہہ اس کے بھائی بندیں
 اور حضور! یہہ اپنے کو بڑا ایماندار اور پارسا سمجھتا ہے۔
 کوئی شخص ایک دن اس کے پاس کہیں سے خط لیکر آیا۔ اُسے خط
 کا جواب دینا تھا، تو اس نے اُس آدمی کے ہاتھ دو پیسے بھیج کر لفافہ
 اور خط کا کاغذ بازار سے مول منگوایا۔ میں نے اُس سے بہت کچھ کہا
 کہ بھئی! دفتری کاغذ پر خط لکھ دو، مگر اُس نے کہا کہ میں اس کو
 خیانت سمجھتا ہوں۔

اور خدا جانے! یہہ ظالم کیا مقوی دو اکھا کرتا ہے کہ دفتر
 کے پورے اوقات میں کام کرتا ہے، بس نماز کے لئے تو ضرور اٹھ جاتا ہو
 ورنہ جب دیکھو، سامنے مسلین رکھی ہیں، اور یہہ مطالعہ میں ڈوبا
 ہوا ہے،

عہدیدارانِ باتوں کو سن رہا تھا، اور اُس کے ماتھے پر عتاب کی شدت سے
 سلوٹیں ابھری چلی آ رہی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے اُسے تیز مرکز کی دوچا
 بوتلیں پلا دی ہیں۔ اُس نے گھنٹی بجائی، چپراسی دوڑتا ہوا آیا۔
 ”شمشاد حسین کو بلا کر لاؤ“

عہدیدار نے انتہائی غرور و تکبر کے انداز میں کہا، اور پایپ ہونٹوں میں دبا کر
 دہواں اڑانے لگا۔ چپراسی نے شمشاد سے کہا کہ ”صاحب! بلاتے ہیں“ شمشاد
 اُس کے کہنے پر عہدیدار کے کمرے میں پہنچا۔ اور اُس نے خود دار انسان کی طرح

سلام کیا اور کرسی پھینچ کر بیٹھ گیا۔ شمشاد کے سلام کے انداز ہنسنے ہی عہدیدار کو گرتا تھا، اب جو وہ بغیر اجازت کے کرسی پر بیٹھا ہے، تو ”صاحب“ کے تن بدن میں لگ ہی تو لگ گئی۔

ایں۔! تم کرسی پر میری اجازت کے بغیر بیٹھ گئے
اس قدر گستاخ ہو تم۔! —————
عہدیدار غصہ کیساتھ
بولا۔

کرسی پر بیٹھنے کے لئے تو اجازت کی ضرورت
نہیں ہے۔ خالی کرسیاں تو انسانوں کے بیٹھنے کے لئے
ہی رکھی جاتی ہیں۔ ————— شمشاد نے انتہائی
متانت کیساتھ جواب دیا

لیکن تم تو میرے ماتحت ہو۔ ————— عہدیدار نے کہا۔
جی ہاں! میں آپ کا ماتحت ہوں، آپ میرے
افسر ہیں، مگر کرسی پر بیٹھنے اور آپ کے ماتحت ہونے
میں وجہ اختلاف آخر کیا ہے؟ ————— شمشاد نے جواب دیا
تم دیکھتے نہیں ہو کہ سوسودو دوسو ماہوار پانچواں
ہمارے سامنے کھڑے رہتے ہیں، تم نے تو ابھی ابتدائی
گریڈ بھی پورا نہیں کیا۔ ————— عہدیدار نے کہا۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ لوگ کس لئے کھڑے رہتے
ہیں، وہ اپنے فعل کے ذمہ دار ہیں۔ ————— شمشاد نے شیعروانی

کاٹن لکھاتے ہوئے

جواب دیا۔

تم بہت ہی زیادہ گستاخ معلوم ہوتے ہو،
عہدیداروں کے سامنے ماتحت کرسی پر نہیں بیٹھا
کرتے، یہہ دفتری دستور ہے، آداب ہے، ڈسپلن ہے۔ عہدیدار پاپ
میز پر رکھتے ہوئے بولا

جناب! اس دفتری دستور کی پابندی کرنے
کے لئے میں تیار نہیں ہوں۔ اور نہ میں ایسا ذلیل ماتحت
بننا چاہتا ہوں۔ شمشاد نے وقار منشا
کیساتھ کہا۔

دفتر کے لوگوں نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ شمشاد حسین
دفتر کے ڈسپلن کی ہر بات میں مخالفت کرتے ہیں۔ عہدیدار نے جواب دیا
میں نے تو دفتر کے ڈسپلن کی کبھی مخالفت نہیں کی۔
جس نے بھی آپ سے کہا، غلط کہا۔ شمشاد نے پھیلی میز
پر پھیرتے ہوئے کہا۔

شمشاد حسین! تمہارے طور طریق ٹھیک نہیں
ہیں، دیکھو! تمہاری رفتار اور گفتار سے غور پسکتا ہے،
تم ابھی نا تجربہ کار ہو، نوکری میں جھک کر رہنا پڑتا ہے،
عہدیداروں کی عزت ہی میں ماتحت کی بھلائی ہے، تم

نے تھوڑی سی دیر میں دو غلطیاں کیں، اول تو مجھے اس انداز کیساتھ سلام کیا، جیسے تم میرے برابر کے عہدیدار ہو، اُس کے بعد بغیر اجازت کے کرسی پر بیٹھ گئے، کیا تم نے دفتر کے لوگوں کو سلام کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ عہدیدار عینک کا گھر ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا

میں ملازمت کرنے کے لئے آیا ہوں، غلامی اور بندگی کرنے کے لئے نہیں آیا۔ میں کسی انسان کو جھکے سلام نہیں کرتا۔ یہ میرے مذہب کی تعلیم ہے۔ شمشاد نے جواب دیا۔ تو تم نے دفتر کے ڈسپلن کی مخالفت کا پکا ارادہ کر لیا ہے، آج ہی تمہارے ہاتھ کی لکھی ہوئی درخواست میرے ملاحظہ سے گزری ہے، اس میں بھی یہی اسپرٹ جھلکتی ہے۔ عہدیدار مونچھوں کوٹا دیتے ہوئے بولا۔

جناب! معاف فرمائیے آپ نے جس چیز کا نام دفتری ڈسپلن رکھ چھوڑا ہے، اس کو دفتر کے ڈسپلن سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، عہدیداروں کو جھکے سلام کرنا، اُن کے سامنے غلاموں کی طرح کھڑا رہنا۔ اُن کو خداوند نعمت اور ان داتا، لکھنا، کیا اسی کا نام آپ کی لغت میں ڈسپلن ہے۔ اگر اسی کا نام آپ نے

ڈسپلن رکھا ہے، تو میں اس ڈسپلن کے ماننے کے لئے تیار
نہیں ہوں۔ اور میں کیا کوئی شریف اور خود دار آدمی
ایسی انسانیت سوز ڈسپلن کے قیام میں مدد نہیں دے سکتا۔ شمشاد نے بیباکی
کیساتھ جواب دیا۔

شمشاد! میں نے اب تک تم کو اپنا ماتحت سمجھ کر
سمجھانے کی کوشش کی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم سیدھو
طریقہ سے سمجھنے والے نہیں ہو۔

میں تم کو ایک ہفتہ کی مہلت دیتا ہوں، اس
عرصہ میں اپنے رویہ کو درست کر لو۔ عہدیدار منتھنے پھلا کر
بولا۔

مجھے تو اپنے رویہ میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی،
پھر مجھے مہلت دینے کی کیا ضرورت ہے۔ شمشاد نے جواب دیا۔
شمشاد! تم میری ایک معمولی سی رپورٹ
پر برخاست ہو سکتے ہو، دیکھو! اب بھی کچھ نہیں بگڑا
مجھے تمہاری جوانی پر رحم آتا ہے۔ عہدیدار نے کہا
آپ کی مہربانی کا شکریہ! مگر ایسے دفتر میں
جہاں کا ڈسپلن، انسان کی عظمت کو ذلیل بناتا
ہو، جہاں بہت سے خداؤں کی پوجا کی جاتی ہو، جہاں کچھ
آداب کا نام خوشامد، چالوسی اور ذلت نفس ہو، اس

دفتر میں ایک شریف اور خود دار انسان بھلا کس طرح
رہ سکتا ہے، آپ شوق سے میرے خلاف رپورٹ کر سکتے

ہیں۔ _____ شمشاد نے شیردانی

سکا کا لہجہ سنا رہی تھی

اچھا۔! تم میرے کمرے سے فوراً چلے جاؤ،
پرسوں تم کو تمہارا اعمال نامہ مل جائے گا۔ عہدیدار نے انتہائی
غصہ کیا تھا جواب دیا۔

آپ کے اخلاق کا بہت بہت شکریہ! اپنے
بلا یا تھا، حاضر ہو گیا، آپ چلے جانے کے لئے کہتے ہیں
جاتا ہوں۔ مگر میرے پاس میرا اعمال نامہ بھیجنے کی کیا
ضرورت ہے۔ اچھا۔! آداب عرض ہے۔

شمشاد یہ کہتے ہوئے، عہدیدار کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ دفتر کے لوگ
بچے کمرے میں سے جھانک رہے تھے کہ دیکھئے کیا گل کھلتا ہے؟ شمشاد کو مطمئن پا کر ان کو
حیرت ہوئی۔ شمشاد نے اپنی جگہ پر آکر استعفا لکھ کر پیش کر دیا، جو بہت زیادہ مختصر
تھا، مگر اس کا ایک ایک لفظ اہل بصیرت کیلئے سرمایہ عبرت تھا، اس نے اپنے پیش کئے
ہوئے استعفیٰ میں لکھا،

عزت نفس اور خود داری کی دنیا میں کوئی قیمت ادا نہیں
کر سکتا۔ زندگی صرف ”عزت نفس“ کا نام ہے، یہہ جاتی رہی تو زندگی
بھی ختم ہو گئی، کوئی عقلمند اور ذی ہوش انسان، اپنے ہاتھوں اپنی

زندگی ختم نہیں کر سکتا۔

پیٹ کا مسئلہ اور روزگار کا سوال اپنی جگہ بہت اہم ہے، مگر عزتِ نفس، اس سے بہت زیادہ اہم اور بلند تر ہے۔ پیٹ بھرنے کے لئے ذلتیں اٹھانا، اپنے جیسے ادیبوں کو پوچھا کرنا، متکبر اور مغرور انسانوں کے مقابلے میں اپنے کو ذلیل سمجھنا، ذلتِ نفس اور توہینِ انیت کی بدترین مثال ہے، اس ذہنیت کے آدمی کی زندگی، اور کتنے کی زندگی کے درمیان، مشکل ہی سے کوئی حدِ فاصل قائم کیجا سکیگی۔

میں اُس مردود و ڈسپلن کی پابندی نہیں کر سکتا، جو دل و دماغ کو غلامی کے تصورات کا پابند بناتا ہو۔ میں عزت کی زندگی چاہتا ہوں، وہ پھول کی سیج کی بجائے، کانٹوں کے فرش پر ہی کیوں نہ حاصل ہو۔

میں استعفا دیتے ہوئے، بڑی مسرت اور اطمینان محسوس کر رہا ہوں، اُس خدا کا ہزار ہزار شکر ہے، جس نے مجھ میں زندہ ہونے کی جرات پیدا کی۔

آئیں جواں مرداں، حق گوئی و بیب کی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی

کچھ ہی کے عہدِ بیدار اس استغفے کو پڑھ کر سکتے ہیں رہ گئے، اُن کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی، کہ اس دُنیا میں کوئی آدمی، ایسی باتیں بھی کر سکتا ہے،

نئی منزل

کلکٹری کی ملازمت سے علیحدہ ہونیکے بعد، شمشاد گھر واپس نہیں گیا وہ اُسی جگہ ایک پبلک ادارے میں نوکر ہو گیا۔ شمشاد ابتدا ہی سے قومی کاموں میں دلچسپی لیتا تھا، تقریر اور مضمون نگاری کی بھی اچھی خاصی مشق تھی، اس لئے اس جدید منزل میں شمشاد کو کسی وقت کا سامنا نہیں ہوا۔ کلکٹری کے دفتر کے مقابلہ میں تنخواہ کم تھا۔ یہاں پر وہ پابندیاں اور ذمہ داریاں نہ تھیں، جن کے گوارا کر لینے کے بعد آدمی خود ہی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے۔ پبلک ادارے کے سب لوگ اُس سے خوش تھے، اور وہ خود بھی اس زندگی سے مطمئن تھا۔

ضلع سے ایک ہفتہ وار اخبار نکلتا تھا، جس کے لئے اخبار کے کارپرداز بڑے اصرار کیساتھ شمشاد سے مضامین لکھواتے تھے، شمشاد کی قومی نظمیں بھی اس اخبار میں شائع ہوتی تھیں۔ چند ہی روز کی مشق میں، شمشاد نگارش کے اسلوب سے واقف ہو گیا، اور اُس کے مضامین عام طور پر پسند کئے جاتے گئے۔ عید سے کچھ دن پیشتر، اخبار کی طرف سے شاندار اعلان شائع ہوا کہ اس مرتبہ نہایت ہی شاندار عید نمبر شائع ہوگا، اخبار کے دفتر کی جانب سے متواتر تقاضے آنے پر شمشاد نے ایک مضمون اور ایک نظم عید نمبر کے لئے روانہ کر دی۔ اخبار کا عید نمبر وقت مقررہ پر شائع ہوا۔ شمشاد کے پاس یہہ شمارہ قدرے دیر سے پھونچا، اُس نے رسالہ کو پڑھنا شروع کیا، تو سب سے پہلے صفحہ پر

ضلع کے ایک دو تہہ شخص کی غزل مندرجہ ذیل نوٹ کیساتھ درج تھی :-
 ہمارے پرچہ کی خوش قسمتی ہے، کہ اُس کو ہندوستان کے
 مایہ ناز شاعر کی قلمی معاونت حاصل ہو رہی ہے۔ ہمارے کرم فرما
 عالیجناب معالی القاب ادب نواز، ادب پرست حضرت مدظلہ
 تعزل میں آج اپنا جواب نہیں رکھتے۔ جناب موصوف نے کبھی منظر
 عام پر آنے کی کوشش نہیں کی، یہ غزل آپ سے بڑے اصرار کے بعد
 حاصل کی گئی ہے، پوری غزل کیف و مستی میں ڈوبی ہوئی ہے یقین
 ہے کہ اُسندہ بھی جناب موصوف اپنے رشحاتِ عالیہ سے اس جہیدہ کو
 رونق بخشیں گے۔

اس نوٹ اور غزل کو پڑھ کر، شمشاد کے تن بدن میں آگ لگ گئی، وہ تو اپنے
 خیال میں صحافتی دنیا کو آزاد اور خوددار سمجھتا تھا، لیکن اخبار کے نوٹ کو پڑھ کر، اُسے
 معلوم ہوا کہ صحافتی دنیا بھی اس لخت سے آزاد نہیں ہے، غزل استقدر ذیل اور
 پست تھی کہ کسی محقول اور سنجیدہ اخبار میں درج ہونیکے قابل ہی نہ تھی۔ شمشاد اخبار کو
لئے ہوئے، اخبار کے دفتر میں پھونکا اور ایڈیٹر صاحب کے کمرے میں درانا ہوا چلا گیا۔

ایڈیٹر صاحب کا رخ آئیے! حضرت شمشاد! ابھی آپ کی بڑی عمر ہے۔
 ابھی ابھی آپ کے مضمون اور نظم کی تعریف کر رہے تھے۔ ایڈیٹر نے کرسی سے
 اٹھتے ہوئے کہا۔

میرے مضمون اور نظم کی آپ لوگ تعریف کر رہے
 تھے، خوب! تو آپ لوگ زبردست بھی ہیں اور منافق بھی

ہیں۔ شمشاد کرسی پر بیٹھتے

ہوئے بولا۔

بھی شمشاد! آج آپ اتنی اکھڑی اکھڑی باتیں

کیوں کر رہے ہیں، ہم منافق ہیں، زر پرست ہیں۔ اس

آپ کا آخر مطلب کیا ہے، اور یہ باتیں بھی تو بالکل نمل

بے جوڑ سی ہیں۔ ایڈیٹر نے پنسل کو کھاتے

ہوئے کہا۔

GuacK!

باتیں تو نہ نمل ہیں اور نہ بے جوڑ، میں جو کچھ کہہ رہا

ہوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ شمشاد نے انتہائی

سنجیدگی کیساتھ جواب دیا۔

آپ نے ابھی فرمایا ہے کہ تم لوگ زر پرست اور

منافق ہو، اس سے آپ کا مطلب کیا ہے، اور آپ کہنا

کیا چاہتے ہیں۔ ایڈیٹر نے شمشاد کی طرف

بغور دیکھتے ہوئے بولا

آپ نے ”عید نمبر“ میں جس آب و تاب کیساتھ

ان..... صاحب کی غزل کو چھاپا ہے، اور جولانہ چوڑا

نوٹ تحریر فرمایا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے

اچھی غزل ان ہی صاحب کی ہے۔ شمشاد نے ”عید نمبر“

ایڈیٹر کے سامنے رکھتے

ایڈیٹر صاحب ! معاف فرمائیے، تو پھر آپ میں
 اور چکلہ میں بیٹھنے والی عورت میں مشکل ہی سے فرق ہوگا،
 وہ بھی ذرا سی دنیا داری کے لئے بناؤ سنگھار کر کے،
 لوگوں کو گانا وانا سننا کر واپنا پیٹ پال لیتی ہے۔
 قسم خدا کی ماتم کر نیکی جگہ ہے، کہ اپنی اس غلطی کا
 ذرا برابر احساس نہیں۔ آپ اخبار کے ایڈیٹر ہیں، اور
 آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ اخبار کے ایڈیٹر کا منصب
 کتنا بزرگ اور اُس کی ذمہ داریاں کتنی مہتمم بالشان اور
 اُس کے فرائض کس قدر اعلیٰ ہیں۔ اخبارات ہی ملک
 و قوم کی ذہنیات کی تعبیر کرتے ہیں، ان ہی اخباروں کے
 صفحات پر روزانہ ہماری زندگی کی تاریخ لکھی جاتی ہے۔
 ہمارے جریدے، قوم و ملک کی عظمت کے نہ صرف
 نمائندے، بلکہ علمبردار ہیں، آپ نے اخبار کی اہمیت
 کو بالکل نہیں سمجھا اور آپ خود اپنے منصب اور فریضہ کو
 ناواقف ہیں، ایڈیٹر کا قلم ملک میں انقلاب پیدا کر سکتا
 ہے، قوموں کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ اخبارات ہی کی
 آواز پر وزارتیں بدل جاتی ہیں، اور حکومتوں کے دستور

کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ شمشاد نے غصہ
 کیا تھا جواب دیا۔

شمشاد صاحب! آپ کی انشا پردازی اور شاعری کا تو ہم کو اعتراف ہے، مگر معاف فرمائیے، دُنیا کا آپ کو تجربہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ارے بھئی! جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، اُس سے زیادہ ہم جانتے ہیں، لیکن یہہ ہندوستان ہے، یورپ نہیں ہے، یہاں تو بڑے آدمیوں کی امداد کے بغیر اخبارات کا چلنا بہت مشکل ہے۔ آپ کی ابھی عمر ہی کیا ہے، زمانہ کے سرد و گرم اور دُنیا والوں کی ذہنیتوں اور اُن کے حالات سے آپ واقف کہاں ہیں؟ آپ کو جب دُنیا سے سابقہ پڑ گیا، تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس دُنیا میں صرف خیالی منطقوں اور ذہنی فلسفے سے کام نہیں چلتا۔ پیسہ بڑی مشکل اور ترکیب سے حاصل

ہوتا ہے۔ _____ ایڈیٹر نے قدرے

مسکراتے ہوئے کہا۔

تو آپ نے صرف پیسہ حاصل کرنے کے لئے اخبار نکالا ہے، آپ کے اخبار کی پالیسی ”حصول زر“ ہے، تو یہ تو بڑا خوفناک دہوکا اور کھلی ہوئی منافقت ہے، آپ کے اخبار پر تو لکھا ہوا ہے:-

”قوم و ملک کا ترجمان سچا خادم“
اور آپ اپنے مقالوں میں اکثر و بیشتر لکھتے رہتے ہیں

کہ ہماری پالیسی بالکل آزاد ہے، ہمارا شیوہ حق گوئی اور بیباکی ہے، لیکن آج معلوم ہوا کہ وہ سب فریب اور بناؤٹ ہے، ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور، کھانیکے اور ہوتے ہیں۔ شمشاد نے جواب دیا۔

وہی منطقیانہ جوابات، فلسفیانہ گفتگو۔ !
بھائی! آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں، آپ سے تو بڑی احتیاط کیسا تھ گفتگو کرنے کی ضرورت ہے، یہ کہس مردو نے کہلے کہ ہماری پالیسی ”حصول زر“ ہے مگر روپیہ پیسہ سے ہم بے نیاز تو نہیں ہیں۔

صرف خریداروں کے چندے سے تو اخبار نہیں چل سکتا، امیر، امراء، اعانت نہ کریں، تو آج ہی انجبا بند ہو جائے، امیروں کے سامنے بھی کچھ نہ کچھ جھکنا پڑتا ہے، اور ضلع کے حاکموں کے پاس بھی سمنوں اور شتھاروں کے لئے جانا پڑتا ہے۔ ایڈیٹر سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

ایڈیٹر صاحب! ایسا اخبار جو امیروں کی آغا اور عدالتی اشتہارات پر چلتا ہو، اس کو قیقنیا بند ہو جانا چاہیئے، اس کی پالیسی کبھی آزاد نہیں ہو سکتی، اس انجبا سے تو ملک اور قوم کو فائدہ پہنچنے کے بجائے اٹا نقصان

پہنچتا ہے

پھر آپ میں اور اُس شخص میں جو چوراہہ پر کھڑا
ہو کر ”سانڈے کاتیل“ بیچتا ہے آخر کیا فرق ہے۔
شمشاد ابھی اپنی بات پوری کہنے بھی نہ پایا تھا کہ اخبار کے ایڈیٹر نے چھینپ کے

آواز دی۔

ارے لڑکے! شبو کے یہاں سے برف کی تلفیاں

تولانا۔

شمشاد نے جانتی اجازت چاہی، ایڈیٹر نے روکا کہ آپ کے لئے برف کی تلفیاں
منگائی ہیں، شمشاد بڑا ملنسار اور غلیظ تھا، مگر آج کی بات چیت نے اسکی طبیعت
کو مکدر بنا دیا تھا۔ اور وہ ایڈیٹر سے ظاہری اخلاق برتنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس لئے
وہ وہاں سے بہت جلد چلا گیا۔

ایڈیٹر صاحب کے کمرے سے بالکل قریب، اخبار کے منیجر صاحب کا کمرہ تھا
جن کو سب لوگ ”منشی صاحب“ کہہ کر پکارتے تھے۔ اُن منشی صاحب کی عمر ساٹھ
سے کچھ اوپر ہی ہوگی، لیکن یہ کوئی پندرہ سال سے اپنی عمر و سچاس سال کی ہی بتاتے
چلے آ رہے تھے، خضاب آلود ڈاڑھی، سرگین آنکھیں، حیدر آبادی اچکن، اور
پایجامہ، غرض ہمارے منشی صاحب ہر وقت بنے ٹھٹھے رہتے تھے، اور اپنی مردانگی
اور آوارگی کے قصے سناتے رہتے تھے۔ منشی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ انکی شکل
شاہ نعیر الدین حیدر شاہ لکھنؤ سے ملتی ہوئی ہے۔

ایڈیٹر نے ان ہی منشی صاحب کو آواز دیکر بلایا، منشی صاحب پان چہلاتے

ہوئے، تشریف لائے۔

منشی صاحب! آپ نے شمشاد صاحب کی باتیں سُنیں... اور۔
ایڈیٹر، ابھی کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ منشی صاحب، ایڈیٹر کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔
بالکل درست دماغ خراب ہو گیا ہے، اس لونڈے کا! دو ایک مضمون اور
غزلیں، اخبار میں کیا چھپیں کہ اپنے کو افلاطون کا سالا سمجھنے لگا۔
ایڈیٹر صاحب! قسم کلام مجید کی، خون کے گھونٹ پی کر، اس کی باتیں
سُننی ہیں، آپ کا منہ تھا، جو مضبوط کر گیا، ورنہ اس کی جوانی کا سارا زور
ڈھیلا کر دیتا۔

میروں کی غزلیں مت چھاپو، اُن کی تعریف مت کرو، قوم و
ملک کی خدمت کرو، اخبار کی پالیسی کو آزار کھو، مطلب یہ ہے کہ
بھوکے مرجاؤ، بیوی بچوں کو سنکھیا دے کر سُلا دو۔ ”قوم، قوم خدمت
وطن“ یہہ آجکل کے لونڈے، بے دین ہو گئے ہیں۔ جو منہ میں آتا ہے بک
دیتے ہیں۔

اُدھر منشی جی نے اگلا دان پیک تھوکنے کے لئے اُٹھایا، اُدھر چہرہ اسی نے اُن ہی جیسا۔
کا خط جن کی غزل بڑی آب و تاب کیساتھ شایع ہوئی تھی، ایڈیٹر کو لا کر دیا۔ اس خط میں
نواب صاحب نے ایڈیٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا، اور پہلی تاریخ کو ایک سو روپیہ دینے
کا وعدہ تھا۔

منشی جی! دیکھئے ہمارے نواب صاحب نے اکیسویں
روپیہ اور دینے کا وعدہ فرمایا ہے، یہ شخص کتنا دریا دل ہے۔ ایڈیٹر، خط منشی جی

کو دیتے ہوئے بولا۔

ایڈیٹر صاحب! دیکھتے جائیے، ایسے کتنے سو، آپ کو وصول ہوں گے، اب کی دفعہ انکی ذرا تصویر توشائع کر دیجئے۔ اور ہاں اہل میں بے گڑھ کے حاکم پرگنہ کے پاس گیا تھا، آپ نے جو ان کی تعریف میں چند جملے لکھے ہیں، ان کو پڑھ کر وہ خوش ہو رہے تھے، اور کہتے تھے کہ میں نے سرکاری طور پر، اس اخبار کے خریدے جانے کی تحریک کی ہے یہ اخبار بڑی بے لگ تنقید کرتا ہے۔ اور ایڈیٹر صاحب! خدا کے لئے پیشکار صاحب کے لڑکے کی شادی کا سہرا اب کی دفعہ ضرور اخبار میں چھاپ دیجئے، کئی سمن اور اشتہار ہمارے اخبار کو مل جائیں گے۔

اور ہاں! ایک بڑی ضروری بات تو بھول ہی گیا۔ یہہ جو ہمارے محلہ کے لوٹوں نے، فلسطین، فلسطین کہہ کر اودھم مچا رکھا ہے، اور اُسی سلسلہ میں جو جلسہ ہونیوالا ہے، اُس جلسہ کی کارروائی کو آپ ذرا جگاڑ کر لکھ دیجئے، پھر دیکھئے، کہ خدا غیب سے کیا صورت پیدا کرتا ہو غرض منشی صاحب بہت دیر تک وعظ فرماتے رہے، اور ایڈیٹر صاحب ایک نیک بخت فرزند کی طرح خاموشی کیساتھ سنتے رہے، اس انداز کیساتھ کہ ہم منہ سے کچھ نہیں کہتے ہیں، لیکن تمھاری ایک ایک بات سے مجھے اتفاق ہے۔ اور وقت پر سب کچھ کر دیا جائیگا۔

جس ادارے میں شمشاد ملازم تھا، اُس کا سالانہ جلسہ ہونیوالا تھا، اُس جلسہ کی صدارت کے لئے بھی شہر کے ایک خان بہادر صاحب کا نام ارکان نے تجویز کیا تھا۔

نے اس کی مخالفت کی کہ ہمارے ادارے کے ارکان میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو جلسہ کی صدارت کے لئے موزوں ہیں، مگر جن کی خدمات بہت زیادہ گر انقدر اور پُر خلوص ہیں۔ لیکن شمشاد کی بات کو کسی نے نہ سنا، اور وہ اس لئے کہ جلسہ کے تمام مصارف خان بہا صاحب نے اپنے ذمہ لے لئے تھے، ایسی صورت میں ان کو صدر بنانا ضروری تھا، کیونکہ صدر بننے کی قومی خدمت کی خواہش ہی نے تو ان کو اس سخاوت پر آمادہ کیا تھا، اور اسی تمنا نے تو ان کے دریائے کرم کو منہوج بنایا تھا۔ جلسہ ہوا اور بڑے دھوم دھام کا جلسہ ہوا صدر صاحب نے اپنا خطبہ جو ایک دوسرے صاحب نے لکھ دیا تھا، اس طرح تن تن کر پڑھا، جیسے کہ اس کا ایک ایک لفظ ان ہی کی تراوش فکرو کارہین منت ہے۔ تمام مقررین نے، صدر صاحب کی تعریف میں زمین، آسمان کے قلابے ملائے دنیا میں جتنی خوبیاں ہو سکتی تھیں، ان سب کا منظر صدر صاحب کو بتایا گیا شمشاد نے، لہو کے گھونٹ پی کر، اس ڈرامہ کو دیکھا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد، وہ سیدھا دفتر کے ادارے میں آیا۔ اور اپنا استعفا پیش کر دیا۔

شمشاد کے کام سے سب لوگ خوش تھے۔ اُس کی مستعدی، اور اُس کے خلوص نے سب لوگوں کو مسح کر لیا تھا، اس لئے اُن کے استعفا پر لوگ اُس کو سمجھانے لگے، مگر شمشاد ان طفل تسلیوں میں آئے مولانا تھا، وہ ادارے سے علیحدگی کا ارادہ کر چکا تھا، اب کوئی طاقت اُس کے ارادے کا رخ نہیں بدل سکتی تھی۔ ادارے سے علیحدگی کے بعد وہ دو تین دن شہر میں رہا اور سوچتا رہا کہ اُسے کہاں جانا چاہیئے؟ اور کیا کرنا چاہیئے؟ بہت سوچ، بچار کے بعد اُس نے یہی فیصلہ کیا کہ اُسے قیصر پور جاکر، کچھ کرنا چاہیئے شہروں کی تہذیب زدہ دنیا اور

جاہ پرست اور ریاکار ماحول میں تو رہ ہی نہیں سکتا اور وہاں کی آب و ہوا اُس کی خود داری کو راس آہی نہیں سکتی۔

خیال کی اصلاح

لہ و اہ! شمشاد نے قیصر پور پہنچ کر، اس بات کا پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کہیں باہر جا کر روزگار کی تلاش نہ کریگا، اس "امارت زدہ" دنیا سے وہ تنگ آچکا تھا، اور شہروں کی زندگی میں اُس کے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ قیصر پور کے باشندے، بہت ہی سیدھے سادے اور تہذیب جدید کی اصطلاح میں "غیر مہذب" تھے، شمشاد ان ہی لوگوں میں ہنسی خوشی کیساتھ رہنے لگا۔ تہذیب و سیاست کی دنیا میں جو منافقت اور ریاکاری پائی جاتی ہے، قیصر پور میں اُس کی پرچھائیں بھی نظر نہ آتی تھی، یہاں نہ تو افسروں اور حاکموں کا تجر کار فرما تھا، اور نہ امیروں اور دولتمندوں کا طمطراق نظر آتا تھا، سب لوگ مل جل کر عزت کی زندگی بسر کر رہے تھے، کوئی شخص کسی سے دوست اور جاہ و منصب کی بناء پر جھک کر نہیں ملتا تھا۔

شمشاد، قیصر پور کی سوسائٹی میں بہت جلد گھل مل گیا، اور سب لوگ اُس سے انتہائی محبت اور خلوص کا برتاؤ کرنے لگے، کوئی شک نہیں کہ قیصر پور کے باشندوں کا شعور، تہذیب و امارت کے اُس اثر سے پاک تھا، جو انسان کو خود اپنی نظر میں ذلیل بنا دیتا ہے، لیکن پھر بھی غیر محسوس طور پر، اس تصور کے

دھندلے نقوش وہاں بھی پائے جاتے تھے اور قیصر پور کے باشندوں کی صحبتوں میں بھی مالدار
دولتمندوں، امیروں اور حاکموں کے تذکرے عجیب عجیب انداز میں کئے جاتے تھے
شمشاد نے، قیصر پور میں اپنے کانوں سے سنا۔

قیصر پور کے راجہ بڑے ہی سخی اور فیاض تھے، ایک دفعہ کچھ
دربار میں گویا راجہ کی ایک طوائف حاضر ہوئی، راجہ جی نے کہا کہ اچھا!
گمانا سناؤ، طوائف نے اتنا اچھا گانا گایا کہ تمام درباری لوگ جھومنے
لگے، راجہ جی نے خوش ہو کر، اپنے گلے سے سچے موتیوں کا مالا اتار کر دیدی
یہہ طوائف بھی بڑی حرفوں کی بنی ہوئی تھی، جب راجہ جی نے اس کو
سچے موتیوں کی مالادی ہے، تو اس نے جھک کر سلام کیا، اور اس
انداز کیساتھ ناچتی ہوئی واپس ہوئی کہ محفل میں سماں بندھ گیا، راجہ جی
نے اس پر خوش ہو کر، اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر پھینک دی۔ سچے موتیوں
کی مالا اور انگوٹھی دونوں کی قیمت پچاس ہزار سے کچھ زیادہ تھی، غرض
راجہ جی نے اس طوائف کی سات پشتوں کو نہال کر دیا۔

بڑے گاؤں کے نواب رونق علی، اپنے وقت کے راجہ اندر
اور واجد علی شاہ تھے، ان کے دربار کے دیکھنے والے لوگ بیان کرتے تھے
کہ ایسی شاندار محفل دیکھی نہ سنی، نواب صاحب نے اپنے آدمیوں کو
ایران بھیج کر، اپنے خاص کمرے کے ناپ کا قالین منگایا تھا، قالین کیا
تھا پھول باغ تھا، بیل بوٹے، روشیں سبزہ سب کچھ اس قالین میں
موجود تھا غرض بنانیوالے نے ایسی کاریگری دکھائی تھی کہ بس اس

١٠
 قالین کو گھنٹوں دیکھتے ہی رہے پھر نرمی کا یہ حال کہ چلتے میں پیر ایک
 ایک باشت قالین میں بندھ جاتے تھے، اُسی محل میں چار فانوس تھے
 رات کو جب وہ فانوس روشن ہوتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہتاب
 چھٹ رہی ہیں، اسی قالین پر، ان ہی رنگین فانوسوں کی روشنی میں
 خوبصورت چھوکر یاں، پھولوں کی جگسیریں اور شراب کی بوتلیں ہاتھوں
 لیکر ناچتی تھیں۔ ان چھوکر یوں کو اتنا مہین لباس پہنایا جاتا تھا کہ
 نگاہیں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتی تھیں۔ نواب صاحب
 جب اشارہ فرماتے، تو چوہدری سولے، چاندی کے پھول ناچنے والوں پر
 پنچھا اور کرتے۔

اور ہاں! یہ نواب صاحب حقہ تو اس شان اور اہتمام
 کیسا تھ پیتے تھے کہ اسکی مثال ملنی دشوار ہے۔ چاندی کی حسین اور بیک
 فرشی، جس پر مینا کاری کا کام، جھل مل کرتا تھا، حقہ کا نیچہ سونیکے
 تاروں کا بنا ہوا، کھواب اور تاش باد لے کے پر، سولے کے تار کیا بھلے
 معلوم ہوتے تھے، اسپر سولے کی بھاری زنجیر، جس میں کبوتر کے انڈے
 کے برابر میرا لگا ہوا تھا، حقہ کی نے میں بندھی رہتی تھی، نواب صاحب
 کے جن کھیتوں میں تمباکو کی کاشت ہوتی تھی، اُن کھیتوں کے لئے میں
 گورکھ پور سے مٹی منگو کر ڈالی جاتی تھی۔ نواب صاحب کیلئے تمباکو
 اور خمیر بڑے اہتمام کیساتھ تیار ہوتا تھا۔ پچاس پچاس روپیہ ہوا
 کے چار آدمی صرف تمباکو بنانے کے لئے نوکر رکھے گئے تھے، خمیرے میر

دیڑھ ٹولہ فی سیر کے حساب سے غنبر ڈالا جاتا تھا، نواب صاحب جب حقہ پیتے تھے، تو ایک ایک میل تک غنبری خمیرے کی خوشبو کی لپٹیں جاتی تھیں۔

اجی۔۔۔ جن نواب صاحب کا آپ ذکر کر رہے ہیں، ان کے بڑے چچا جن کو چھوٹے نواب کہتے تھے، عجیب و غریب آدمی تھے۔ گرمیوں میں ڈھاکا پائُن کی مہین ملل کا کرتا پہنتے تھے، چوڑے پانچم کا پاجامہ سفید ٹوپی، بھٹی، بیہ لباس ان کے جسم پر کیا کھٹنا تھا دن دو وقت جوڑا بدلتے تھے، میں نے ایک دفعہ ان کے یہاں کھانا کھایا تھا آج تک زبان اس کے مزے لے رہی ہے۔ اُن کے یہاں کے کھانوں کی کیا تفصیل بیان کروں، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی پانچ طرح کا تو پلاؤ تھا، اناس کا پلاؤ میں نے پہلی مرتبہ ان ہی کے یہاں کھایا تھا، قورمہ میں بادام پڑے ہوئے، ہرن کے کباب، بھٹی ہوئی بیڑیں، پسنہ کا ہریہ، لوز، زردہ، موتیا، اور صاحب! فیرینی تو اس مزے کی تھی کہ اب بھی اُس کے تصور سے مُنہ میں پانی بھرتا ہے، ان ہی نواب صاحب کے یہاں کے لوگ کہتے تھے کہ ان کے یہاں ڈھائی سو روپیہ روز کا، دسترخوان کا خرچ ہے۔

ہمارے والد جن قاضی صاحب کے یہاں ملازم تھے، انکی آمدنی ایک لاکھ روپیہ سال سے کچھ اوپر ہی تھی۔ قاضی صاحب خاٹوں کے زمانہ میں برن پیتے تھے، کہتے ہیں کہ کسی حکیم نے ان کو بہت

ہی گرم کشتہ کھلا دیا تھا، قاضی صاحب کے چار بیویاں تھیں، اور پندرہ بیس طوائفیں نوکر تھیں، ایک طوائف، متھر کے کسی سیٹھ کے یہاں ملازم تھی، قاضی صاحب نے اگر وہ میں کسی محفل میں اسے دیکھ لیا، او ان کی طبیعت اس پر آگئی، قاضی صاحب نے گھبرا کر اپنے مصاحبوں سے کہا کہ اس طوائف کو جیسے بھی بنے، لیکن آؤ، مصاحبوں نے کہا کہ سرکار! متھر کا ایک بنیا، اس کو پانچ سو ماہوار دیتا ہے، اور ہم نے سنا ہے کہ اس طوائف کے لئے اس سیٹھ نے بیس ہزار روپیہ لگا کر ایک حویلی تیار کرادی ہے اور وہ اس پر بری طرح ریختا ہوا ہے، قاضی صاحب نے فرمایا کہ میں ایک لاکھ روپیہ تک اس پر خرچ کر سکتا ہوں، وہ جوتی بند بنیا بھلا کہیں ہمارا مقابلہ کر سکتا ہے، وہ پانسو دیتا ہے، ہم ایک ہزار روپیہ ماہوار دیں گے۔ تو بھائیو! آپ جانتے ہیں کہ روپیہ کے زور سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا، پیسہ کی کرامات کا کیا پوچھنا! قاضی صاحب کے مصاحبوں نے ایک ہفتہ کے اندر اس طوائف کو قاضی صاحب کے یہاں لا کر پیش کر دیا۔ قاضی صاحب کو ایک لاکھ روپیہ کے قریب روپیہ خرچ کرنا پڑا، مگر صاحب بھورت بھی قیامت کی تھی، اس کی نزاکت کا کیا پوچھنا، بالکل چھوٹی موٹی اور دھان پان تھی، پان کی سبک، اس کے گلے کی رگوں میں سے صاف نظر آتی تھی۔

علی گنج میں ایک زمیندار ہیں، ان کے بڑے کی ابھی حال میں مسلمانیاں ہوئی تھیں، اس تقریب میں انہوں نے اتنا زنا دتی

کیساتھ کھانا پکایا تھا، کہ زردے اور بریانی کی بسییوں دیکھیں تو زمین میں دفن کر دینا پڑیں، ان ہی صاحب کے یہاں مشکلی گھوڑوں کی چوٹی ہے، بس گھوڑے کیا ہیں، موتیں۔ ان گھوڑوں کا ناشتہ دودھ اور جیلیبیوں سے ہوتا ہے، کلابتوں کی قیمتی ڈوریاں ان گھوڑوں کی گردلوں میں بندھی، ان ہی صاحب کے بڑے بھائی کو کتے پالنے کا شوق ہے، کئی سوروپیہ مہینہ کتوں کی غور و پرداخت پر خرچ ہوتا ہے، ایک کتا انہوں نے کسی فوجی انگریز سے دو ہزار روپیہ میں مول لیا ہے، اب اُن کو اُسی میل کی گتیا کی تلاش ہے، اور وہ اس کے لئے پانچ ہزار روپیہ تک خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں۔

ہمارے ضلع میں ایک انگریز کلکٹر آیا تھا، جسے شکار کا بہت شوق تھا، ایک ایک دن میں سو سو مرغیاں اور قازیں اُس نے شکار کی ہیں، اتنا بڑا آدمی ہو کر، شکار کی تلاش میں تین تین میل پیدل چلتا تھا، یہہ انگریز بڑے اخلاق کا آدمی تھا، ضلع میں کانگریس کے لوگ ستیاگرہ کر رہے تھے، لوگوں میں جوش پھیلا ہوا تھا، میرے نانا کا ضلع کے لوگوں پر بڑا اثر تھا، کلکٹر صاحب نے اُن کو مشورہ کرنے کے لئے بلایا۔ میرے نانا کا ضلع کے لوگوں پر بڑا اثر تھا، کلکٹر صاحب نے اُن کو مشورہ کرنے کے لئے بلایا، میرے نانا جب صاحب کی کوٹھی پر پہنچے ہیں تو وہ سیر ہیوں تک اُنچے لئے آیا، اور اپنے ہاتھ سے دیا سلائی جلا کر، ہمارے نانا کی مگرٹ

یہہ جو اشان گرٹھ کے خان بہادر صاحب ہیں انکی خورک اتنی کم ہے کہ دوسرا آدمی اتنا کم کھائے، توکل مڑتا ہو تو آج مر جائے، صبح کو دو چوروں کا شور بہ پیتے ہیں، اور دو پہر کو بہت ہی ہلکی دو چپاتیاں کھاتے ہیں، اُس کے بعد تیسرے پہر کو سیب کے مڑے کی دو قاشیں چاندی کے ورق کیساتھ، اور شب میں گیہوں کا میٹھا دلیا، اور تھوڑا سا دودھ!

صاحب! یہہ ہمارے ضلع کے نواب زادہ صاحب بڑے ہی مذہبی اور مسلمان آدمی ہیں۔ اب کے اجیر شریف کے عرس میں گئے تو دو ہزار روپیہ کی لاگت کی چادر بنا کر لے گئے، بہتر قسم کی محفل پر سچا کام ہوا تھا، جب انگریزی باجے کیساتھ، یہہ چاد اجیر شریف کی گلیوں سے نکلی ہے، تو سب لوگ تعریف کرتے تھے۔

اور صاحب! نواب زادہ صاحب درویشوں، فقیروں اور مجذوبوں کے تو عاشق ہیں، ذرا کسی نے کہہ دیا، کہ فلاں جگہ مجذوب رہتے ہیں، بس آپ پھر وہاں جو ان کو دن میں دس بیس مرتبہ بیٹھا دیکھیں گے۔

کلیم گنج کی بڑی مسجد کے پاس جو خانقاہ ہے، وہاں ایک مجذوب رہتے ہیں، میں نے اُن مجذوب صاحب کی زیارت کی ہے، دن رات چرس اور بھنگ پیتے ہیں، ان کی داڑھی

دھوئیں سے لال ہو گئی ہے، مگر صاحب اکیسے بافیض بزرگ ہیں جو زبان سے کہہ دیتے ہیں، پورا ہو کر رہتا ہے، نواب زادہ صاحب، تو اُنکے اتنے معتقد ہیں کہ مہینوں کلیم گنج میں آکر رہتے ہیں، مجذوب صاحب ان کو گالیاں دیتے ہیں، مگر نواب زادہ صاحب ہنس ہنس کر اُن کے پیر دباتے ہیں۔ مجذوب صاحب کے نشہ پانی کا سارا خرچ نواب زادہ صاحب ہی کے ذمہ ہے۔

شمشاد نے ان لوگوں کی باتوں سے محسوس کیا، کہ یہ لوگ بھی خیالی طور پر اُسی لعنت میں گرفتار ہیں، جس لعنت سے وہ پیچھا چھڑا کر، یہاں آیا ہے شمشاد نے انتہائی نرمی اور خوش کلامی کیساتھ، اُن لوگوں کے خیالات کی اصلاح کی۔ پہلے پہل تو لوگ ذرا چونکے، اور اعتراضات کرنے لگے، لیکن شمشاد نے اس قدر معقول اور نفسیاتی انداز میں جوابات دئے، کہ سب لوگ مان گئے، اور شمشاد کی باتیں اُن کے دلوں میں گھر کر گئیں۔

شمشاد نے قیصر پور کے لوگوں کو بتایا کہ دُنیا نے ”بڑائی“ کا معیار مقرر کرنے میں بڑی غلطی کی ہے، ”بڑائی“ روپیہ پیسہ، جائیداد اور عہدے کا نام نہیں ہے، بڑا اور عزت والا وہ ہے، جو کیر بکیر رکھتا ہے، کسی کمال کا حامل ہے، اور اپنے بھائیوں کیساتھ بھلائی، ہمدردی اور عزت کیساتھ پیش آتا ہے۔ بہت سے چور ڈاکو اور جواری آپ کو ملیں گے، جو بہترین کھانا کھاتے، اچھے سے اچھا کپڑا پہنتے اور بڑے عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں، تو کیا صرف عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے سبب، اُن کو ”بڑا آدمی“ کہا جائے گا۔ طوائفوں کے مکانوں کو جا کر دیکھو، تو تم کو

قیمتی قالینوں، چاندی کے اگالداؤں، دودھ سے زیادہ سفید چاندنی، جھاڑ فائوس اور اسی قسم کے اسباب آرائش کی ایک نمائش نظر آئے گی۔ تم طوائفوں کے قیمتی لباس کو دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے، ان کی کلائیوں میں سینکڑوں روپیہ کے سنگن اور ان کی گردنوں میں ہزاروں کے ہار پڑے ہوں گے، تو کیا اس آرائش اور عیش و عشرت کی زندگی کے سبب تم ان کو بڑا آدمی کہہ دو گے؟ انسانیت کی نگاہ میں وہ باعصمت عورت جس کے بدن پر ایک چاندی کا تار بھی نہیں ہے، جس کے کپڑوں میں ہشمار پیوند لگے ہوئے ہیں، جس کے اٹھے ہوئے بالوں کو مدت سے تیل کی ایک بوند بھی نصیب نہیں ہوئی، ان آبرو باختہ طوائفوں کے مقابلہ میں زیادہ معزز اور محترم ہے۔

اچھے کھانے کھانا، بہترین لباس پہننا، عالیشان محلوں میں رہنا، طوائفوں کے گھرانے سنا، کوئی کمال کی بات نہیں ہے، اور ان چیزوں کا انسانیت کی بڑائی سے ذرہ برابر کوئی تعلق نہیں ہے، آپ ایک چمار اور بھنگی کو دولت دیدیجئے وہ ان لوگوں سے جن کو آپ ”بڑا آدمی“ کہتے ہیں، زیادہ ہلش کر کے، اور بہت زیادہ اہتمام اور طمطراق کیساتھ رہ کر دکھا دیگا، طوائفوں کو ہزاروں کی مالائیں اور انگوٹھیاں دیدینا کوئی کمال نہیں ہے، سخاوت نہیں ہے، سیرجشی نہیں ہے۔ اور مشکی گھوڑوں اور کتوں کو دودھ اور جلیبیاں کھلانے سے بھی کوئی انسان بڑا آدمی نہیں بن جاتا۔

وہ نواب جو ہزاروں روپیہ صرف پینے کے تمباکو اور خمیرے پر خرچ کر دیتا ہے پرلے درجہ کا احمق اور فضول خرچ ہے، ایسا نفس پرست انسان جو دولت کو دھوئیں کی طرح اڑا دیتا ہے، دنیا کے کس کام کا! وہ کسی کے دکہ درد سے کیا واقف ہو سکتا ہے، اُسے کیا خبر کہ چند پیسوں کے لئے خدا کا ایک بندہ دھوپ میں کھڑے ہو کر بھاڑ چلاتا ہو۔

دس قسم کے پلاؤ۔ بس قسم کے مڑے، پچاس قسم کی چٹنیاں کھانیسے آدمی بڑا نہیں ہو جاتا۔ بہت سے جنگلی جانور بہترین قسم کے پھل کھاتے ہیں۔ ایسے پھل جو امیروں کو بھی میسر نہیں، دیکھتے نہیں ہو کہ تتلیوں اور قمریوں کے پر کتنے رنگین اور جاذبِ نظر ہیں! بھونرے کیسی نرم و نازک پتیوں اور کونپلوں پر بیٹھ کر تانیں اڑاتے ہیں تو اس منزل میں آپ کے یہ ”بڑے آدمی“ جانوروں اور چڑھیوں سے شاید کچھ سمجھے ہی ہیں۔

جن صاحب نے اپنے ”فرزندِ ارجمند“ کی ختنہ کی تقریب میں اتنا بہت سا کھانا بچا لیا تھا، کہ کھانے کو زمین میں دفن کر نیکی نوبت آئی، تو انہوں نے انتہائی حما اور بے ڈھنگے پن کا ثبوت دیا۔ یہہ حشرِشی اور فیاضی نہیں ”حماقت“ اور ”چغیت“ ہے۔

کلکٹر صاحب اگر شکا کے شوق میں تین تین میل پیدل چلتے تھے، تو اُس میں کیا کمال ہوا، تم میں سے بہت سے لوگ روزانہ دس دس بارہ بارہ میل پیدل چلتے ہیں، اب رہی کلکٹر صاحب کی خوش اخلاقی، تو وہ تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے، جب وقت پڑتا ہے تو آدمی گدھے کو بھی باپ بنا لیتا ہے، کلکٹر صاحب نے دیکھا کہ رعایا فرنیٹ اور برگشتہ مہور ہی ہے، ایک بار سوخ آدمی کی ضرورت ہے کہ وہ اس شور و شکر کو اپنے اثر سے دبا سکے، بس اسی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اُس نے آپ کے نانا کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا۔ اس کو اخلاق اور انسانیت سے کیا واسطہ! یہہ تو منافقت اور ریا کاری ہوئی۔!

آپ کے وہ خان بہادر صاحب جو بہت کم کھانا کھاتے ہیں تو وہ یقیناً معدہ کے مریض ہونگے، اگر یہہ بات نہ ہوتی تو وہ بریانی کی قابیں کی قابیں کھا کر بھی بڑا کارنہ

لیتے اُن کی یہ کم خوری اس لئے نہیں ہے کہ وہ اپنی خوراک میں سے کچھ حصہ غریبوں کو دے دیتے ہیں، بلکہ صرف صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ معذور ہیں، اُن کی خوراک سے ہٹ کر دیکھیے کہ وہ عیش و عشرت کی کس مد میں کمی کرتے ہیں۔ اور پھر اُن کی خوراک کی جو تفصیل آپ نے پیش کی ہے، وہ کچھ کم تو نہیں ہے، دو چوزوں کا شوربہ، جو شخص صرف ناشتہ میں ڈکار جاتا ہو، اس کو کم خوراک کہتے ہیں۔ تعریف کے قابل تو وہ لوگ ہیں جو ایک وقت روکھی سوکھی کھا کر، مٹی کھودتے ہیں۔ سبھی ہوئی نرم و گداز مسہر دینے لپٹنے والے، اگر چوزوں کا شوربہ پی کر، اور سیب کا مربہ کھا کر، مزے اڑاتے ہیں، تو اس میں تعریف کی کیا بات ہے۔

جن نواب زادے صاحب کو آپ نے مذہبی اور بڑا خدمت پرست بتایا، میرا بس چلے تو اُن کی خدا پرستی اور مذہبیت کے تمام چوڑے میلے کر دوں۔ بھائیو! ذرا عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے، مذہبیت تو اُس چیز کا نام ہے جس کے لئے خدا اور رسولؐ نے حکم دیا ہو، اگر کوئی چیز خدا اور رسولؐ کے احکام کے خلاف ہے، اُس پر عمل کر نیوالے کو ”مذہبی“ کہنا، دوسرے لفظوں میں مذہب کا مذاق اڑانا ہے، انگریزی باجہ کیسا تھ زری کے کام کی جگہ گاتی ہوئی چادر کی نمائش کرنا، کیا قرآن وحدیث سے ثابت ہے؟ اسلام نے نمود و نمائش کی سخت مذمت کی ہے، دو ہزار روپیہ جو اُن نواب زادہ صاحب نے چادر کے بنوانے میں صرف کئے ہیں، کاش! اس کے آدھے روپیے غریبا و مساکین پر خرچ کئے جاتے۔

اب رہا مجذوبوں اور درویشوں کی عقیدت کا معاملہ، سو اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ دولت مند اور امیر جن کے گناہوں اور سیاہ کاریوں کی کوئی

نہیں ہوتی، اپنی نجات کے لئے سہل سے ذرائع اور حیلے تلاش کرتے رہتے ہیں، تلافیِ مافات کی ان میں طاقت نہیں ہوتی، اور جس عیش کی زندگی کے یہہ عادی ہو جاتے ہیں، اور جو سیاہ اعمال و افعال، ان کے کردار کا جز بن جاتے ہیں، اُن کو یہہ چھوڑ نہیں سکتے، تو اب یہہ لوگ اسی تلاش اور جستجو میں رہتے ہیں، کہ کوئی مجذوب یا فقیر، ان پر کچھ پڑھ کر بھونک دے تاکہ ان کا ”معصیت زدہ“ بدنِ جہنم کے شعلوں سے محفوظ رہ سکے۔ یا کوئی ایسی دُعا یا ایسا وظیفہ ہاتھ لگ جائے، کہ ادھر دو بول منہ نکلے، اور ”مقصود“ سامنے موجود۔ اتم دیکھو گے کہ اس قسم کے مجذوبوں، نفیوں اور درویشوں کے سب سے زیادہ معتقد، یہی آپ کے راجہ اور امیر، اور طوائفین ہوتی ہیں۔ طوائف کے یہاں کوئی شخص دُھلے ہوئے کپڑے پہن کر نہ بچ جائے، اُسکی بیحد خاطر و مدارات کی جائیگی وہ طوائف جو بڑے سے بڑے امیر کو بھی خاطر میں نہیں لاتی، فقیروں کو دیکھ کر زمین پر پچھ جائیگی۔ آپ نے جس ”مجذوب دوستی“ اور ”دریش پرستی“ کا نام ”مذہبیت“ رکھا ہے۔ اُس منزل میں طوائفین، آپ کے اُن اجاؤں اور امیروں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔

بزرگوں کے مزاروں پر بھی یہہ طوائفین اس قدر عقیدت کیسا تھ، نظر میں چھپا ہوئے اور ساڑی کے پلو سے سر چھپائے ہوئے حاضر ہوتی ہیں، جیسے یہہ بیچاری بڑی ہی اللہ والی ہیں، اور صاحبِ مزار سے ان کو سچ مچ بڑی عقیدت ہے، یہی حال آپ کے اُن امیروں کا ہے، جن کی تعریف کرتے کرتے آپ کی زبان خشک ہوئی جاتی ہے۔

شمشاد کی باتوں کا قیصر پور کے لوگوں پر بہت اثر ہوا، اور اُس کے خیالات کا جا بجا

چرچا ہونے لگا۔ شمشاد نے ان خیالات کی تبلیغ اس لئے کی تھی کہ غریب اور نادار لوگوں میں جو پستی اور ناخود شناسی پائی جاتی ہے، وہ دور ہو جائے۔ غریب لوگ عام طور پر امیروں اور راجاؤں کے عیش و عشرت اور ٹھاٹ باٹ کے قصے سن کر، اپنے کو بہت ہی پست اور ذلیل محسوس کرتے ہیں۔ اور یہی ذلت کا احساس، اُن کو سوسائٹی میں کسی طرح اُبھرنے کا موقعہ نہیں دیتا۔ اور امیر ہی اور غریبی کے تصورات اُن کو آگے نہیں بڑھ دیتے۔ عام طور پر لوگوں کی صحبتوں میں، امیروں اور راجاؤں کی باتیں اور انکی داستانیں بیان کی جاتی ہیں، چھوٹے بچے بھی ان کو سن کر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں، کہ عزت اور شرافت کا معیار بس جاہ و دولت ہے، اس قسم کا ذکرے، حقیقت میں نسلوں کو تباہ کرتے ہیں، اور لوگوں میں اُبھرنے کا احساس اور اپنی عزت آپ کرنے کا جذبہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ امارت اور دولت کے بہتہ مذکرے، خود داری اور عزت نفس کے دشمن ہیں، شمشاد کا اپنے خیالات کی تبلیغ سے یہی مقصد تھا، کہ قیصر پور کے لوگوں میں خود داری کا احساس پیدا ہو جائے اور وہ دو لقمندوں اور امیروں کے مقابلہ میں اپنے کو فروتر نہیں بلکہ برتر سمجھیں۔ اُس نے لوگوں سے کہا کہ تجربہ یقیناً بُری چیز ہے، لیکن متکبر کیساتھ تکبر کا برتاؤ کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ جو تم سے جھک کر ملے، اُس کے پاؤں چوم لو، اور جو تم سے اکڑ کر پیش آئے، اُس کا

ہر بھی ٹھکراؤ۔

مساوات

قیصر پور میں چند دو لقمند اور زمیندار رہتے تھے، شمشاد کی باتوں پر ان کے کان کھڑے ہوئے، اور اسکی تبلیغ کو انہوں نے شبہ کی نگاہ سے دیکھا۔ قیصر پور کی پبلک

شمشاد کی بالکل مٹھی میں تھی، اس لئے یہ لوگ شمشاد کی کھل کو مخافت نہ کر سکتے تھے، اپنی خاص محفلوں میں یہ لوگ شمشاد کو بُرا بھلا کہتے تھے شمشاد کو بھی معلوم ہو گیا، کہ مالداروں کا طبقہ اس کی تبلیغ کو پسند نہیں کرتا۔

شمشاد نے ان لوگوں کے پاس آنا جانا شروع کیا، اور اپنے اصل مقصد اور سبک تمام پہلوؤں سے اُن کو آگاہ کر نیکی کوشش کی۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ شمشاد اُن کی دولت چھین کر، غریبوں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہے، شمشاد نے اُن کو بتایا کہ وہ زمینداروں اور دولت مندوں کا دشمن نہیں ہے، وہ یہہ نہیں چاہتا کہ اُن کا روپیہ لوٹ کر، لوگوں میں بانٹ دے۔ بلکہ وہ امیروں اور زمینداروں میں غریبوں اور پریشان حالوں کی پریشانی کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے، اُس کا مقصد یہہ ہے کہ مالدار لوگ، غریبوں کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھیں، بلکہ اُن کیساتھ برابری کا برتاؤ کریں، اور اُن کے دکھ درد میں شریک ہوں، مالداروں اور زمینداروں کو اس طعون اور مردود خیال کو چھوڑ دینا چاہیے کہ غریب لوگ اُن کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں، اور اُن کو ”سرکار، حضور“ کہہ کر پکاریں۔ امیروں اور زمینداروں کو اپنے عیش و آرام اور فضول خرچی کے شعبوں کو کم کر کے، غریبوں اور پریشان حالوں کی امداد کرنی چاہیئے کہ یہی دولت کا بہترین مصرف اور خدا کی دی ہوئی نعمت کے شکر ادا کرنے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے، خدا نے دولت، اینٹ پتھروں کی سجاوٹ، جنگ و بربط کے نعموں سے لطف اندوز ہونے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے لئے نہیں دی، دولت اسی لئے دی جاتی ہے کہ خود کھاؤ، اور دوسروں کو کھلاؤ، جس طرح تم اچھا کھانا، اور اچھا پہنا جانتے ہو، دوسرے بھی تمھاری طرح جسم اور جان رکھتے ہیں، جاڑوں میں اگر تم محفل کے گدوں اور اطلس کے نرم لحافوں کو نہیں چھوڑ سکتے

تو کم سے کم اتنا تو کرو کہ غریبوں کے لئے کھدر کے لحاف فراہم کر دو، تم قورمہ کھاتے ہو، تو ان کے لئے اطمینان کیسا تھ دو وقت دال، روٹی کھانے کا انتظام کر دو۔

شمشاد کی باتوں کا قیصر پور کے دو متمنطقہ پر بڑا اثر ہوا، اور مالداروں نے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ ہم میں واقعی بہت سی کمزوریاں موجود ہیں، جن کے دور کرنے کیلئے ہم انتہائی کوشش کریں گے۔ جو مالدار مسلمان تھے، انہوں نے پابندی کیسا تھ زکوٰۃ ادا کرنی شروع کی، اور زکوٰۃ کے علاوہ بھی تھوڑی بہت رقم پبلک کے کاموں میں وہ لوگ دینے لگے، ہندوؤں نے بھی اس طرف توجہ کی، اور انکی آمدنی میں سے ایک حصہ پبلک کاموں کے لئے لیا جانے لگا۔ قیصر پور کے بعض کھاتے پیتے ہندو، صبح سویرے شکر، بتاشے اور گڑ پکڑ قبضہ کے باہر، چیونٹیوں کے سوراخوں میں ڈالا کرتے تھے، شمشاد نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ یہ کوئی ثواب اور پُن کا کام نہیں ہے۔ روپیہ کا یہ بالکل بے محل مصروف ہے، اُس نے کہا کہ گھوڑے، گائے، بھینس، بیل، بکری، وغیرہ جانور، جن سے ہم کام لیتے ہیں، انکی روزی مہیا کرنا واقعی ہمارا فرض ہے، اگر ہم ان کے معاملہ میں کوتاہی کریں گے تو یہ بڑا ظلم ہوگا، لیکن چیل، کبوتر، ہرن، سانپ، کچھ، بندر، چیونٹے وغیرہ جانداروں کی روزی کی فراہمی انسانوں کے ذمہ نہیں کی گئی، یہ جاندار اپنی روزی خود مہیا کرتے ہیں، شمشاد نے کہا کہ بھوکے انسانوں کو چھوڑ کر، چیونٹوں کو شکر اور بتاشے کھلانا، ثواب نہیں ظلم ہے، ہندوؤں نے شمشاد کی باتوں کا بہت اثر لیا۔ اور اس طرح ہر مہینہ کافی رقم پبلک کاموں کے لئے جمع ہونے لگی۔

قیصر پور کا ایک مہاجن، جس کی زندگی کا مقصد اعلیٰ دولت بٹورنا اور سود لینا تھا، شمشاد کی باتوں پر بہت چراغ پا ہوا۔ شمشاد نے اُس مہاجن کو بہت کچھ سمجھایا

کہ جب سب لوگوں نے ایک بات کو مان لیا ہے، تو تم کو بھی اُس کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ مگر اُس کچھو سس ظالم نے شمشاد کی ایک نہ سنی، اب شمشاد کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ وہ اُس مہاجن کو سوسائٹی کا دباؤ ڈال کر درست بنادے۔ چنانچہ شمشاد کی تحریک پر اُس کا حقہ پانی بند کیا گیا، اور تمام لوگوں نے اُس کا بائیکاٹ کر دیا۔ مہاجن کے پاس دولت بہت تھی، لیکن گھر باہر کا کام کاج کرنے کے لئے دولت کے ہاتھ پاؤں تھوڑی ہوتے ہیں۔ اس کے نوکروں نے ہڑتال کر دی تھی، بازار سے کوئی اُسے سودا بھی مول نہ دیتا تھا، وہ سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ مہاجن کو اب قدر ہوئی کہ اُس کے غریب نوکر، جن کو وہ ذلیل سمجھتا تھا، کتنے کام کے آدمی تھے، ان کے بغیر اس کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ اور روپیوں سے بھری ہوئی تجوریاں، اور لپٹے چوڑے بھی کھاتے، غریبوں کی امداد کے بغیر بیکار ہیں۔ پہلے پہل تو مہاجن کو بہت غصہ آیا، وہ ضلع میں پہنچا، اور افسروں کی جھوٹی سچی باتیں باور کر کے، حاکم پرگنہ کو قیصر پور بکلا کر لے آیا۔ حاکم نے قیصر پور کے لوگوں سے تبادلہ خیال کیا تو معلوم ہوا کہ واقعی وہاں کے لوگوں نے اُس مہاجن کا بائیکاٹ کر دیا ہے، ڈپٹی صاحب نے لوگوں کو ڈرایا دہمکایا کہ تم ایسا کرو گے، تو تم پر مقدمہ قائم کر دیا جائیگا، ڈپٹی کی اس دہمکی کا بڑا سخت جواب دیا گیا، ڈپٹی نے قیصر پور میں دو تین دن رہ کر اس بات کا اندازہ لگایا، کہ یہاں کے لوگوں میں بہت زیادہ ایکٹ ہے، اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں، شمشاد نے ڈپٹی سے کہا کہ ہم اپنی اصلاح کر رہے ہیں، اور اپنی اصلاح کرنا اور اپنی بہتری کے لئے تدبیریں سوچنا کوئی جرم نہیں ہے، بلکہ ہم نے تو اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے، جو حکومت کو کرنا چاہیئے تھا، اس لئے ہم قابلِ عتاب و ملامت نہیں، بلکہ لائقِ تعریف و تحسین

ہیں کہ حکومت کی ذمہ داریوں کے بار کو ہم ہلکا کر رہے ہیں۔

ڈپٹی نے یہ صورتِ حال دیکھ کر، مہاجن سے کہا کہ حکومت اس میں دخل بچر اپنی مشکلات میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی، تم کو اگر قیصر پور میں رہنا ہے تو مل جل کر رہو، مہاجن نے چند دن کے لئے، اپنی روش میں نرمی پیدا کر لی، لیکن جب اُس سے سوچنا کرنے کے لئے کہا گیا، تو وہ بہت سٹ پٹایا، اور اُس نے آخر کار، قیصر پور کی سکونت ترک کر دی، اُس مہاجن کے جانے کے بعد، قیصر پور کی فضا بالکل پاک ہو گئی۔

قیصر پور کے دو متمند، اور امیر لوگ، غریبوں اور مزدوروں کیساتھ، نہایت محبت اور صاف دلی کیساتھ پیش آنے لگے، شمشاد نے امیروں کی ذہنیت بدلنے کے لئے امیروں پر اس بات کو فرض کر دیا کہ سلام آداب اور نمسکار میں، وہ مسابقت کریں، چنانچہ قیصر پور کی گلیوں میں لوگوں نے دیکھا کہ مزدور، کاندھے پر بیٹھا ہوا بورا ڈالے چلا جا رہے، اور ایک مالدار شخص فٹن میں بیٹھ کر، اُس مزدور کو سلام کر رہا ہے۔ امیروں اور دو متمندوں کے یہاں امیری، غریبی کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا، دعوتوں اور جلسوں میں امیر، غریب سب ایک جگہ مل کر بیٹھتے تھے۔ پہلے پہل، تو دو متمندوں نے اپنی طرز زندگی کی تبدیلی میں تکلیف محسوس کی، کہ لیکن بعد میں اُن کو معلوم ہوا کہ زندگی حقیقت میں سادگی، بے تکلفی، اور ابتائے جنس کی ہمدردی کا ہی نام ہے۔ وہ لوگ اب دوسرے لوگوں کی امداد میں، ایک خاص لذت محسوس کرنے لگے، غیریت اور اجنبیت کے حجابات ایک ایک کر کے چاک ہو چکے تھے، ہر شخص، دوسرے کو اپنے سے قریب سمجھتا تھا، ہمدردی اور باہمی امداد کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا، اور سب لوگ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے، دو سال کے اندر، ایک مقدمہ بھی سرکار کی عدالت

میں نہیں گیا، اول تو جھگڑے ہی کم ہوتے تھے، اور کبھی جھگڑا ہو جاتا تھا، تو آپس کے لوگ جھگڑے کو چکا دیتے تھے۔

دوسرا قدم

شیشاد نے کوشش کر کے ایک فنڈ قائم کر دیا تھا، جس سے مزدوروں اور کسانوں کو ضرورت کی وقت امداد دیا جاتی تھی، مزدوروں کی شرح اجرت اس قدر کافی مقرر کی گئی تھی، کہ ایک دن کی مزدوری میں، ایک کسان اپنے بال بچوں کے لئے فراغت کیسے، دو دو کا کھانا فراہم کر سکتا تھا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ ہندوستان کی زمین ہونا اگلتی ہے، اپنی جگہ پر بہت بالکل ٹھیک ہے، لیکن وہ کسان جو اپنا خون، پسینہ ایک کر کے زمین سے سونا نکالتا ہو، ایک ایک پیسہ کے لئے ترستا ہے، اور اُس غریب کو کبھی اطمینان اور چین کی زندگی نصیب نہیں ہوتی۔ غلہ کی منڈی کے بھاؤ کی کمی، بیشی مہاجنوں اور تاجروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ اپنے حالات کے لحاظ سے بھاؤ کو اتارتے، چڑھاتے رہتے ہیں کسان کو لگان، نقدی کی شکل میں دیتا ہوتا ہے اسلئے نقدی حاصل کرنے کے لئے پوڈا کو منڈی میں جا کر بیچنا ضروری ہے، اور منڈی کے ”ڈکٹیٹر“ مہاجن اور بنیے ہوتے ہیں، لہذا کسان کو ہمیشہ ایک نئی مصیبت سے سابقہ پڑتا ہے۔

انسانوں اور جانوروں کیساتھ بیمار یاں اور دکھ تو لگے ہوئے ہیں، عین تخم ریزی کے وقت، کسی کسان کا بیل مر گیا، یا بیمار ہو گیا، اُس غریب کے پاس

بیل مول لینے کے لئے روپیہ تو ہو ہی نہیں سکتا، ہاں! چند من غلہ ضرور موجود ہے سو اس غلہ کو اگر وہ فروخت کر ڈالے، تو اُس کا کنبہ فاقہ کرنے لگے، اس لئے مجبوراً اس کو کسی مہاجن کے پاس سودی قرضہ لینے کے لئے جانا پڑتا ہے، یہہ ہندوستان کے مہاجن اور بنیئے، یہودیوں سے بھی زیادہ لالچی اور ناخدا ترس ہوتے ہیں، ضرور انسان کی ضرورت اور پریشان حالی سے ان کو فائدہ اٹھانا خوب آتا ہے۔

یہہ غریب کسان، جس کا بیل مر گیا ہے، کسی مہاجن کے یہاں قرض لینے کے لئے جاتا ہے، مہاجن جس کی توند، گاؤں تکہ کو بھی شرماتی ہے، قالین پر لیٹا ہوا حقہ پیتا ہوتا ہے، کسان کو دیکھتے ہی وہ اپنے ”عقل کل“ منہم کو برا بھلا کہنے لگتا ہے کہ تمام روپیہ اُدھار میں بانٹ دیا، کسان بیچارہ، اس گفتگو کو سن کر سہم جاتا ہے، اور اب مہاجن من مانی شرح سود پر جو قرضہ عنایت فرماتے ہیں، تو وہ گویا بیچارے کسان پر بڑا کرم کرتے ہیں، اور بھولا بھالا کسان بھی یہی سمجھتا ہے کہ مہاجن نے قرض دیکر، اُس پر بڑا احسان کیا ہے۔ کسان روپیہ لے کر خوشی خوشی گھر جاتا ہے، اور اپنے گاؤں سے، یا بازار سے بیل خرید لیتا ہے۔

اب یہہ کسان، مہاجن کے چکر سے عمر بھر نہیں نکل سکتا، سود کا پھیلاؤ خدا کی پناہ! ادا قرض لے، اور پوتا چکائے، پھر بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ جائے، کسان کو اپنی پسند اور کا ایک حصہ بصورت نقدی، سود میں دینا پڑتا ہے، اور اصل بدستور اپنی جگہ قائم! ضرورتیں تو آئے دن نکلتی ہی رہتی ہیں، اب جب کہ کسان کو روپیہ کی ضرورت پڑتی ہے، تو وہ اُسی مہاجن کے پاس سودی قرضہ لینے کے لئے جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ اُس سا ہوکا رکی ”اسامی“ بن جاتا ہے۔

اور عمر بھر سودہ کے پھندے سے نہیں نکلتا۔ ان مہاجنوں، ساہوکاروں اور
بینوں کے ہاتھوں، کسانوں کی زندگیاں تباہ ہیں، اور ان ظالموں کے لاپتے
چوڑے پہیے کھاتے، ان غریبوں کے تقدیر کے نوشتے ہیں، اُن میں جو لکھا ہوگا،
وہ پورا ہو کر رہے گا۔

قیصر پور میں شمشاد کی کوششوں نے ایسا معقول انتظام کر دیا تھا کہ کسانوں
کو، مہاجنوں اور ساہوکاروں سے سودی قرضہ لینے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی،
قصبہ میں ایک فنڈ قائم ہو گیا تھا، جس سے کسانوں کو قرض حسنہ دیا جاتا تھا، اور
بعض بہت زیادہ غریب اور غیر مستطیع کسانوں کی امداد بھی کی جاتی تھی۔ قصبہ کے
کسان اور مزدور، شمشاد پر جان چھڑکتے تھے، شمشاد جب کھیتوں میں جاتا تو
کسانوں کے بچے، اُسے گھیر لیتے، شمشاد اُن کو پر لطف باتیں سنا کر، خوب
ہنساتا، اُن کیساتھ آنکھ مچولی کھیلتا، بچے خوش ہو کر، سرسوں کے پھول اُس پر
چکھا کر کرتے۔

گاؤں کے بچوں کے لئے، مختلف محلوں میں کئی مدرسے قائم کئے گئے ان
مدرسوں میں امتحان پاس کر کے، سند حاصل کر لینے کے لئے تعلیم نہیں دی جاتی تھی، بلکہ
تعلیم کا مقصد تھا شعور کی تربیت اور کردار کی پاکیزگی ایسی تعلیم جو بچوں کے شعور
کو ترقی دے سکے، اور اُن کے دل و دماغ کو روشن بنا سکے، کسانوں کے بچوں کیلئے
کھیتی باڑی کی مفید باتیں بھی بتائی جاتی تھیں، ہندوستان کے کالجوں اور اسکولوں
میں جو شاندار کرسیاں، میزیں اور تنپائیاں پائی جاتی ہیں، اور جہاں کے لوگ
اور لڑکیاں ہر وقت ”غلان“ و ”حور“ بنے رہتے ہیں، اور جس ماحول میں تربیت

پالنے کے بعد، آدمی محنت و مشقت کا عادی نہیں رہتا، اور وہ ہر وقت ”کلکٹر“ اور ”تحصیلدار“ بننے کے خواب دیکھا کرتا ہے، قیصر پور کے مدرسوں میں اُس تہذیب و تعلیم کا ایک نقش بھی نظر نہ آتا تھا، یہاں کے مدرسوں کا ماحول بالکل سادہ اور فطری تھا یہاں بچوں کو ”انسپکٹر“ ”ڈپٹی“ اور ”ہیڈ کلرک“ بنانے کے لئے نہیں، بلکہ کھان، لوہار، بڑھئی اور دوکاندار بنانے کے لئے تعلیم دی جاتی تھی۔ ان مدرسوں میں ایسے اُستاد کام کرتے تھے جو اسکول کے اوقات کے علاوہ بھی بچوں کے کردار و اخلاق پر نگرانی رکھتے تھے، ان مدرسوں کے اُستاد، کالجوں اور سکولوں کے اُن پروفیسروں اور باسٹروں سے بالکل مختلف تھے، جو اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ کر کنگنا ناچ بھی دیکھ سکتے ہیں، اور جو کلاسوں میں نصاب پڑھا کر یہہ سمجھتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

مدرسوں کے بچوں کی ورزش جسمانی کے لئے، ایسے کھیل مقرر کئے گئے تھے، جو ایک طرف تو بچوں کی جسمانی صحت کے لئے مفید تھے، دوسری طرف اُن کھیلوں کی مشق، بچوں کی آئندہ زندگی میں بھی کام آسکتی تھی بعض لوگوں نے انگریزی کھیلوں کا ذکر لکھ لانا و شمشاد نے کہا کہ انگریزی کھیل، ہندوستانی بچوں کے لئے قطعاً ناموزوں اور غیر مفید ہیں۔ انگریزی کھیلوں پر جتنا صرف ہوتا ہے اتنے روپیہ سے کئی مدرسے قائم کئے جاسکتے ہیں، مغرب کے رہنما والوں کے پاس روپیہ کی بہتات ہے، وہ اپنے کھیلوں کے مصارف برداشت کر سکتے ہیں، مگر وہ ہندوستان، جہاں لاکھوں خدا کے بندے رات کو بھوکے سوتے ہیں، وہاں ان ”شاہی کھیلوں“ کی کھیت نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ

کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، ٹینس، بیڈمنٹن سے اگرچہ جسمانی ورزش تو ہو جاتی ہے مگر انسان کی زندگی میں ان سے کبھی کام نہیں پڑتا، کرکٹ کا بہترین کھلاڑی، زندگی کی منزل میں کس کام کا؟ اور ٹینس کے چمپین کو زندگی کی بھاگ دوڑ سے کیا سروکار؟ گاؤں کے کھیل البتہ اس قسم کے ہیں جن سے زندگی کے بہت سے کام سیکھتے ہیں، مثال کے طور پر، کھیل جس میں ایک لڑکا چور بن کر بھاگتا ہے، اور ایک پارٹی اس کا پیچھا کرتی ہو، کتنا مفید کھیل ہے، کبڈی کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے، کبڈی کا کھلاڑی، دشمنوں کے غم سے بچنے اور بھاگتے ہوئے دشمن پر حملہ کر نیچے ڈھنگوں سے واقف ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ زندگی میں ایسے بہت سے مواقع آتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر بھی، غیر ملکی کھیلوں کے قبول کر نیچے یہ معنی ہیں کہ ہم ذہنی طور پر دوسروں کے غلام ہیں، لہذا ہم کو وہ کھیل کھیلنے چاہئیں جو ہماری کھل قومی اور ملکی شعور کو ترقی دیتے ہوں، اور ہماری ملکی ضروریات اور داعیات کی بدولت ظہور میں آئے ہوں۔

غرض شمشاد نے قیصر پور کے ماحول کو ”بہشت کدہ“ بنا دیا۔ ہر شخص اپنی جگہ مطمئن اور شادماں تھا، بیواؤں کی اُہوں، یتیموں کے آنسوؤں اور مصیبت زدوں کی زاریوں کے لئے، قیصر پور کی فضا میں گنجائش ہی نہ تھی، وہاں تو خدا کے شکر کے ترانے، بچوں کے قہقہے، معصوم لڑکیوں کی مسکراہٹیں اور کسانوں کے گیت فضا میں گونجتے تھے۔

ضلعدار کی لڑکی

اسی زمانہ میں، جب کہ شمشاد قیصر پور کی تنظیم کر رہا تھا، محکمہ ہند کے ایک ضلعدار نے

قیصر پور کو اپنا مستقر بنالیا تھا۔ کچھ دن تک تو یہ ضلعدار تنہا رہا، اُس کے بعد وہ اپنے بال بچوں کو بھی وہاں لے آیا۔ یہ ضلعدار ایک کرایہ کے مکان میں رہتا تھا، اور اسی مکان کے ایک حصہ میں اُس کا دفتر تھا، شمشاد کو قیصر پور میں غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل تھی، سب لوگ اُس کو وقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، محکمہ ہند کے ضلعدار نے بھی شمشاد سے ربط مضبوط کرنا شروع کیا، شمشاد بہت جلد گھل مل جانے والا نوجوان تھا ضلعدار اُس سے بہت جلد مانوس ہو گیا، اور دونوں ایک دوسرے کے گھر آنے جانے لگے۔ ایک دن شمشاد، ضلعدار کے مکان کے مردانے حصہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ اُس کے کان میں عورت کے گانے کی آواز آئی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی شخص، کسی لڑکی کو موسیقی کی تعلیم دے رہا ہے تھوڑی دیر میں بالکل صاف آواز آنے لگی، اسپر شمشاد نے ضلعدار سے پوچھا کہ اندر کون گارہا ہے، ضلعدار نے جواب دیا کہ میری لڑکی کو موسیقی سے بہت دلچسپی ہے، ایک شخص جو فنِ موسیقی میں بڑی شوق و مہارت رکھتا ہے، ہر اتوار کو ضلع سے آکر اُسے موسیقی کی تعلیم دیتا ہے شمشاد نے اس سلسلہ کو اُس وقت طول دینا مناسب نہ سمجھا، وہ اُس وقت تو کچھ کہے سے بغیر چلا گیا، لیکن اس واقعہ کے ایک ہفتہ کے بعد موقع پا کر اُس نے ضلعدار سے اس ذکر کو چھیڑا۔

ضلعدار صاحب! آپ نے اُس دن فرمایا تھا کہ آپکی صاحبزادی موسیقی کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں — شمشاد نے فرمایا کیا جی ہاں! کوئی ایحال سے میری لڑکی شریفہ، موسیقی سیکھ رہی ہے، شریفہ کو موسیقی سے فطری مناسبت ہے، آواز میں قدرت نے نوح دیا ہے، ایحال میں اُس نے

غیر معمولی ترقی کی ہے۔ فلم کے بہترین ریکارڈوں کی ایسی نقل اتارتی ہے۔ جیسے سچ مح ریکارڈ بنج رہے ہیں۔ ضلعدار نے جواب دیا یہہ جو صاحب! آپ کی صاحبزادی کو موسیقی سکھانے کے لئے آتے ہیں، اُن سے آپکی صاحبزادی غالباً پردہ تو کرتی ہونگی۔ شمشاد بولا۔

شمشاد صاحب! آپ تو خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ کی باتیں کر رہے، کہیں اُستادوں سے پردہ کیا جاتا ہے اور جو شخص شریفہ کو موسیقی سکھانے کے لئے آتا ہے، وہ تو قسم خدا کی فرشتہ ہے، فرشتہ! ضلعدار نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

اچھا! تو آپ شریفہ کو موسیقی اس لئے سکھا رہے ہیں کہ اُس کو اس فن لطیف سے فطری مناسبت اور طبعی دلچسپی ہے۔ شمشاد نے دریافت کیا

جی ہاں! یہہ وجہ بھی ہو سکتی ہے، مگر سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ شریفہ کی جس شخص کیساتھ نسبت ہونیوالی ہے اُس کی فرمائش ہے کہ لڑکی کو موسیقی کی تعلیم دیجائے۔ ضلعدار نے جواب دیا۔ ضلعدار صاحب! میں آپ کا دوست ہوں، او دوست کا فرض ہے کہ اپنے دوست کو کسی خطرناک اور پریشان کن غلطی میں مبتلا نہ ہونے دے سب سے پہلی

چیز جو حدود و قیاس قابل اعتراض ہے، وہ آپ کی صاحبزادی کا ایک غیر مرد کے سامنے بے پردہ ہونا ہے، میں بدگمانی سے بالکل خالی الذہن ہو کر عرض کرتا ہوں، کہ جس شخص کو آپ فرشتہ سمجھتے ہیں، اُس کے کردار کا آپ کچھ کس حد تک تجربہ ہے؟ اور بالفرض وہ آپ کے بقول فرشتہ ہی ہے، تو یہی مذہب اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان، احتیاط کی ایک حد قائم کر دی ہے، اور وہ اس لئے کہ انسانی نفس میں ہزاروں چوریاں اور بُرائیاں چھپی ہوئی ہیں، اور اگر ایک فرشتہ صفت انسان کو ڈھیل دیدی جائے یا اس کو مواقع حاصل ہوں، تو اُسکی لغزش کا ہر وقت امکان ہے، اور اس بات کا فیصلہ ہر شخص اپنے نفس کا جائزہ لے کر خود ہی کر سکتا ہے۔ شمشاد نے جواب دیا۔

شمشاد صاحب! میں آپ کو بہت روشن خیال سمجھتا تھا، مگر یہہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ آپ بھی مسجد کے ملاؤں کی طرح تنگ خیال ہیں، آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ تہذیب و تمدن نے کتنے جدید مسائل ہمارے سامنے پیش کر دیے ہیں اور انقلاب کی رفتار معاشرت کو کس قدر بلند دیکھنا چاہتی ہے۔

مذہب نے عورت اور مرد کے درمیان پردے کی جو
احتیاطی حقایق کی ہے، اُس کا میں قابل نہیں ہوں، زمانہ کا
انقلاب اُس حد کو خود بخود توڑ رہا ہے۔ اور اب نقابوں اور
برقعوں کا زمانہ نہیں رہا۔ _____ ضلع دار نے تیز آواز

میں کہا۔

آپ کے اظہارِ تاسف کا شکریہ! تو آپ ان لوگوں
میں سے ہیں جو ہوا کے رُخ پر چلتے ہیں، وہ خود اپنا کوئی
نصب العین نہیں رکھتے، زمانہ ایک چیز کو آج اچھا
سمجھتا ہے، تو وہ بھی اُسکی اچھائی کے قابل ہو جاتے ہیں،
کل زمانہ اُسکی بُرائی کا فتویٰ دیتا ہے، تو یہ بھی زمانہ کی ہاں
ہاں میں ملانے لگتے ہیں۔ اس لحاظ سے عرب کے وہ جہلاء
جو ذرا سی بات پر خون کے دریا بہا دیتے تھے، اور شراب
جو، بدکاری اور ایسے ہی بہت سے فواحش، اُن کی زندگی
کا جز بن گئے تھے، کسی طرح بھی قابلِ ملامت نہیں ہیں،
اس لئے کہ اُس زمانہ کا تمدن ان ہی چیزوں کو پسند کرتا تھا
اور عرب کی جاہلیت کا تمدن یقیناً اس نقطہ نظر سے

قابلِ تعریف تھا۔ _____ شمشاد نے جواب دیا

یہ کون مردود کہتا ہے کہ عرب کا وہ تمدن جس نے
جاہلیت میں نشوونما پائی تھی اچھا تھا، آپ تو آج کچھ ہی

بہکی سی باتیں کر رہے ہیں' _____ ضلعدار نے کہا۔

آپ نے عرب کے تمدن کا ذکر نہیں کیا، لیکن آپ
کی گفتگو سے یہ نتیجہ خود بخود نکلتا ہے، کہ زمانہ کے پیدا کئے
ہوئے تمدن، اور جدید مسائل کی تقلید کرنی چاہیے، تو اس
صورت میں اچھائی اور بُرائی کا تو کوئی معیار ہی نہیں رہا
اس نقطہ نگاہ کے تحت تو تمدن جس بات کو اچھا بتاتا ہو
وہ اچھی ہے، اور تمدن جس کو بُرا کہتا ہے بُری ہے۔

ضلعدار صاحب معاف فرمائیے! آپ جس
تمدن کو روشن اور آزاد سمجھتے ہیں، وہ عیاشی اور مادی
دماغوں کی پیداوار ہے، جو تمدن، عورتوں کے رقصِ میاں،
شراب، قمار بازی اور اس قسم کے بہت سے فواحش پر
فخر کرتا ہو، کیا اُس تمدن سے انسانیت کی کوئی خدمت
ممکن ہے

عورت کی عظمت اور اُس کی آزادی سے کس کو
انکار ہے، مگر یورپ کے تمدن نے، عورت کو بے حیائی اور فحاشی
کی اُس منزل میں کھڑا کر دیا ہے، جس کا ڈانڈا، کتے اور سؤ
کی زندگی سے ملتا ہے، اب اگر کوئی اس تمدن پر حروت گیر ہوتا،
تو آپ اُس کو کٹھ مُلا، قدامت پرست اور تنگ خیال

بتاتے ہیں _____ شمشاد میز پر جھکتے

ہوئے بولا۔

آپ تو یورپ کی سنی سنائی باتوں کے سبب
بہت بدگمان ہو گئے ہیں، کوئی شک نہیں کہ وہاں بے
اعتدالیاں پائی جاتی ہیں، مگر آپ تو رائی کا پہاڑ بنا

رہے ہیں _____ ضلعدار نے جواب دیا۔

ضلعدار صاحب! مجھے آپ کے حسن ظن اور
نیک گمانی پر افسوس آتا ہے۔ کیا آپ یورپ کے
اخباروں اور رسالوں کا مطالعہ نہیں فرماتے، اور کیا
آپ کسی ایسے شخص سے نہیں ملے، جس نے یورپ جا کر
وہاں کی زندگی کا مطالعہ کیا ہو، میں نے زیادہ تفصیل میں
جانے کی کوشش نہیں کی، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ مغرب کے
لوگ عرب کے جاہل وحشیوں سے بہت زیادہ آگے ہیں
وہاں کے اخلاق و کردار کا یہ عالم ہے کہ لفظ ”دوشیزگی“
صرف کتابوں میں لکھا ہوا ملتا ہے، نسلی پنڈیاں کھلا
ہوا سینہ، ناچ، رنگ، پاؤں و سیلین، سیر و تفریح،
بے باکی بس ان ہی چیزوں کا نام ”عورت کی آزادی“

ہے _____ شمشاد نے کہا۔

مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ یورپ کے تمدن
میں بے احتیاطیاں پائی جاتی ہیں، لیکن، بخواب!

عیب مجملہ بگفتنی ہنرشش نیز بگو!

وہاں عورتوں کو معاشرت میں برابر کا حصہ دیا
جا رہا ہے، عورتیں اس قابل بنائی جا رہی ہیں کہ اپنے
پاؤں پر خود کھڑی ہو سکیں، اور مردوں کی دست نگر

بن کر نہ رہیں، _____ ضلعدار نے جواب دیا۔

ضلعدار صاحب! رونا تو اسی کا ہے کہ ہم یوٹو
کے تمدن کے تمام مسائل کو قبول کرتے چلے جاتے ہیں، اور
اُن پر غور کرنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے، اسی
”مرعوبیت“ نے ہمارے دماغوں اور خیالوں کو ”مغرب
زدہ“ بنا دیا ہے، اور ہماری مذہبی اور تمدنی خصوصیات
ایک ایک کر کے فنا ہو رہی ہیں۔

بظاہر تو یہ چیز بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے کہ عورتوں کو
معاشرت میں برابر کا حصہ دار بنایا جائے، عورتیں بیسٹر
بنیں، جج بنیں، سپرنٹنڈنٹ پولس بنیں، کمانڈر انچیف
بنیں، غرض کار و بار کی تمام شعبوں میں اُن کو داخل
کر لیا جائے، لیکن فطری طور پر یہ چیز، بالکل الٹی اور
فطرت کے حدود سے افسوس ناک تجاوز ہے۔

مرد اور عورت، داخلی اور خارجی، جسمانی اور
فطری اعتبار سے، مختلف واقع ہوئے ہیں، اس چیز کو

سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے، ہر شخص معمولی تفکر کے بعد اس بات کو سمجھ سکتا ہے، عورت کے قوائد مرد کے قوائد کے مقابلہ میں نازک لطیف اور ذکی لیس ہیں، وہ سخت کام جن کو مرد انجام دیتا ہے، ان کو اگر عورت ہاتھ لگائے گی تو اسکی جسمانی ساخت کو صدمہ پہنچے گا، اور دوسرے معنی میں وہ اُن حدود سے تجاوز کرے گی، جو اسکی مقرر کی گئی ہیں، پھول کی ڈالی کی اہمیت اور لطافت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ اُس سے جھڑپی کا کام لیں گے، تو پتہ یہ فیصل پھول کی نازک ڈالی پر بڑا ظلم ہوگا۔

علم تشریح الابدان نے یہہ چیز ثابت کر دی ہے، کہ عورت اور مرد دماغی طاقت کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں، چنانچہ عورت کے دماغ کا وزن، مرد کے دماغ کے وزن سے کم ہوتا ہے، اور یہی حال اسکی کھوپری کے اُن نشیب و فراز کا ہے جن کو "تلافیق دماغ" کہتے ہیں۔ لہذا یہ تصور بالکل غلط ہے کہ عورت اور مرد یکساں فرائض انجام دے سکتے ہیں۔

تو عورتیں ناقص العقل ہیں! ————— ضلع دار بات کاٹتے

ہوئے بولا۔

ناقص العقل نہیں، بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ مردوں کے مقابلہ میں انکی جسمانی اور دماغی ساخت یقیناً کمزور ہے، اور اس سے عورتوں کی توہین کا پہلو نہیں نکلتا، اور وہ اس لئے کہ

اُن کو جس کام کے لئے بنایا گیا ہے، وہ خود اپنی جگہ انتہائی اہم ہے، اور جب عورت اپنے کام کو چھوڑ کر، مرد کے کام پر ہاتھ ڈالے گی تو وہ یقیناً فطرت کی نظر میں خطا کار ٹھہریگی۔

آپ خود غور فرما سکتے ہیں کہ عورت پر بلوغ کے بعد کتنی پابندیاں عاید ہو جاتی ہیں، مرد بالغ اور متاہل ہونے کے بعد بھی آزاد ہے، اور عورت شادی ہونیکے بعد کتنی جسمانی تبدیلیاں اور پابندیوں میں گرفتار ہو جاتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد اور عورت اپنے اپنے فرائض میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اور دونوں کی مختلف راہیں ہیں، یہ نہ نظام خود فطر نے مقرر کیا ہے، اس نظام کی جب بھی خلاف ورزی کی جائے گی، نظام معاشرت میں اختلال پیدا ہو جائیگا۔ عورت تدبیر منزل کی ملکہ ہے، اسکا کام گھر کا انتظام اور بچوں کی پرورش ہے، مرد کا کام روزی کی فراہمی ہے، لہذا جب عورت تدبیر منزل کی ذمہ داریوں سے گھبرا کر، روزی کی منزل میں آئے گی، فطر نظام تہہ وبالا ہو جائے گا۔

یورپ ہی کو لے لیجئے، کہ وہ اپنے افسوسناک تجربے پر کس قدر متاسف ہے۔ انسانی نسلوں کی درآمد کی راہیں بند ہو رہی ہیں، اور عورتوں نے مرد بننے کی ہوس میں گھر بیٹو زندگی کو قریب قریب خیر باد کہہ دیا ہے۔ اس کے خوفناک

نتائج سے گھبرا کر، یورپ پھر عورتوں کو گھریلو زندگی کی طرف
 ڈھکیں رہا ہے۔ شمشاد نے دبیر میں سے

پان نکالتے ہوئے کہا۔

بھئی! آپ کی طرح میں نے منطق تو نہیں پڑھی،
 اور تمدن و تہذیب کے فلسفہ پر بحث کرنے کے لئے میں تیار بھی
 نہیں ہوں، شمشاد صاحب! آپ تو بڑے ایر پھر سے
 بات کرتے ہیں بات کچھ شروع ہوئی تھی، اور آپ نے بحث
 کچھ چھڑ دی۔ میری لڑکی شریفہ کا جن سے رشتہ ہو نیا والا؟
 انہوں نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ لڑکی کو موسیقی کی تعلیم
 ضرور دلائی جائے، اور میرے خیال میں، اس میں کوئی برائی

بھی نہیں ہے۔ ضلعدار نے جواب دیا

سب سے پہلی برائی تو یہ ہے کہ ایک نوجوان غیر مرد
 آپکی صاحبزادی کے دانش پریش بیٹھ کر تانیں اڑاتا ہے، موسیقی اور
 شعر کا سب سے بڑا کام جذبات کو برا لگینے کرنا ہے، اب آپ
 خود ہی غور فرمائیے، کہ وہ خلوت جو نغموں سے معمور ہو، اس میں
 ایک جوان مرد اور جوان لڑکی کا رہنا احتیاط کے کس قدر خلاف
 ہے، ضلعدار صاحب! یقین جانئے کہ اس کے صرف تصور سے
 میرے رونگٹے کھڑے ہوئے لگتے ہیں، میں بدگمانی نہیں کرتا
 لیکن احتیاط سے توجہ ہٹا لینے کے بعد بے اعتدالیوں کا امکان

ہو سکتا ہے، اور پھر شعرا و نغمہ سے تو اچھے خاصے آدمی کے دل میں گدگدی ہونے لگتی ہے، اور آدمی کا دماغ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

اب رہا آپ کے ہونیوالے داماد کا اصرار، سو اس کے متعلق میں یہ عرض کرتا ہوں کہ خدا کے لئے ایسے شخص کیساتھ اپنی صاحبزادی کی قیمت وابستہ نہ کیجئے جو اس بات پر نہ صرف رضا مند ہے بلکہ مصر ہے کہ اسکی ہونیوالی بیوی کو ایک غیر دمد سے موسیقی کی تعلیم دلائی جائے۔

جناب ضلعدار صاحب! زندگی صرف غیرت، حمیت اور

جیا کا نام ہے، اس سے گذر کر، زندگی باقی ہی نہیں رہتی، مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا، اب آگے آپ کو اختیار ہے — اور — ہاں —

شمشاد پوری بات کہہ بھی نہ پایا تھا کہ محکمہ نہر کے اہلکار اور ملازمین آگئے، اور شمشاد کو سلسلہ گفتگو ختم کر دینا پڑا۔ اس کے بعد بھی شمشاد نے ضلعدار کو کتنی مرتبہ توجہ دلائی، اور خوب تفصیل کیساتھ سمجھایا، مگر ضلعدار اپنی بات پر قائم رہا۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی مرد اپنی بہن بیوی کی کسی اور عزیزہ کو آزادی دیدیتا ہے تو پھر اس دی ہوئی آزادی کے واپس لینے کی یا اس پر احتساب اور روک ٹوک کر لینے کی اس کو جرات نہیں ہوتی سو سائٹی کی اصطلاح میں اسی چشم پوشی، اور بے حمیت کی نام آزادی روشن خیالی اور شائستگی ہے، اگر کوئی بھلا مانس اپنی بیوی کی آزادی روشن پر روک ٹوک کرتا ہے تو سو سائٹی کی اصطلاح میں اس کو خنگ نظر اور قدامت پرست کہا جاتا ہے، اس کو عورتوں کے کیریکٹر پر اعتماد کرنا

چاہیے، اگر کوئی عورت کسی غیر مرد سے تنہائیوں میں ملتی ہے پیاؤ کے
 نغموں سے لوگوں کو خوش کرتی ہے، اور خوب بن سنور کر کلب گھروں
 میں جاتی ہے، تو اس سے عورت کے کردار پر کیا اثر پڑتا ہے۔ جو شخص
 ان باتوں پر روک ٹوک کرنا، تہذیب جدید کی نگاہ میں وہ بدگمانی
 کا مجرم ہے، خوب کہا، اکبر الہ آبادی نے۔

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
 اُسے غیرت نہیں آتی، انہیں غصہ نہیں آتا

موسیقی کے پرد میں

۱۰۲

ضلع دار کی لڑکی شریفہ کو جو شخص موسیقی کی تعلیم دیتا تھا، وہ مشن اسکول میں مدرس
 تھا، اس شخص کا قد پست، رنگ سیاہ اور ناک نقشہ بہت زیادہ غیر دلچسپ تھا، اُسکی
 عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی، اس شکل و صورت کے عیب کو چھپانے کے لئے یا حسین
 بننے کی غلط فہمی کے باعث، وہ بہت زیادہ بن ٹھن کر رہتا تھا، چہرے کا رنگ تو پاؤڈر
 اور کریم سے سفید نہ ہو سکتا تھا، اور نہ مفلر اور نکٹائی، ناک نقشے کو درست کر سکتے تھے
 مگر ہاں بالوں کو اُس نے تیل، صابون اور دوسری چیزیں لگا کر، خوب چمکدار اور ملائم بنا
 لیا تھا، اور بالوں کی خوبصورتی دکھانے کے لئے وہ اکثر ننگے سر رہتا تھا۔ اس شخص کے متعلق
 عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں، کوئی کہتا تھا کہ اس کا باپ موجی تھا، جو آخر عمر میں عیال

عیسائی ہو گیا تھا کوئی کہتا تھا کہ اسکی پرورش عیسائیوں کے مشن میں ہوئی ہے کبھی کبھی بیان
 تھا کہ یہ لاد مذہب سا آدمی ہے۔ عیسائیوں میں کہتے تھے عیسائی ہوں، اور مسلمانوں میں
 مسلمان بن جاتا ہے، ضلع اور صاحب سے لوگوں نے اس شخص کے مذہب کے متعلق دریافت
 کیا، تو انہوں نے بتایا کہ یہ شخص ہے تو مسلمان ہی مگر اس کا بیان ہے کہ میں ابھی تک
 مذاہب کی تحقیق کر رہا ہوں، ہر حال مذہبی اعتبار سے اسکی زندگی ایک راندنی ہوئی
 تھی لوگ اس کو ماسٹر محمود کے نام سے پکارتے تھے اور نام کے لحاظ سے لوگ اس کا بہ چال

مسلمان سمجھتے تھے۔۔۔
 اس قسم کے لوگ اجیسا یہ ماسٹر محمود تھا، اپنی پاکبازی اور کردار کے زہد سے کاٹھ
 جانے کے لئے ابتدا میں بہت ہی پارہ ساری جتن کرتے ہیں۔ اور جب لوگوں کو ان کے بہاں چلن
 کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ تو پھر اسی اطمینان اور اعتماد کی آگ بکھڑو سب کچھ کر
 بیٹھتے ہیں جس کی کسی شریف تو یہی آوارہ انسان سے بھی توقع نہیں کیجا سکتی۔ شریف
 کے والد (ضلع دار) اور اس کے گھر کے دوسرے لوگوں نے بھی کئی مہینہ تک ماسٹر محمود
 کی چال ڈھال اور طور و طریق پر نظر رکھی یہ ماسٹر نے لگا ہوں کو پہچانتا اور تیوروں کو
 بھانپتا تھا، جب تک لوگ اس کو شک اور امتحان کی نظر سے دیکھتے رہے اس نے
 انتہائی بناوٹ اور دیاکاری سے کام لیا اور لوگوں کے دکھانے کے لئے شریف کے ساتھ
 اس طرح پیش آتا تھا جیسے یہ کچھ جانتا ہی نہیں ہے، اور اس کا کووار فرشتوں سے ملتا
 جلتا ہے۔ ماسٹر محمود جیسے ہم آگے چل کر صرف "ماسٹر" کے نصف نام سے یاد کریں گے
 ضلع دار کے گھر میں اس قدر متانت اور سنجیدگی کیساتھ داخل ہوتا کہ لوگ خواہ مخواہ
 اس کا احترام و عقیدت کیساتھ غور مقدم کرتے شریف دہڑتی ہوئی آتی، اور اس کو آداب

کرتی تو نہایت ہی بے پروائی کیساتھ آداب کا جواب دیتا، اور موسیقی سکھاتے وقت بہت ہی کم شریفہ کی طرف دیکھتا، اُس نے اپنے مصنوعی اور بناوٹی خشک انداز سے لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھادی تھی کہ اُس کو شریفہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور وہ صرف حیثیت استاد موسیقی، اپنا فرض ادا کرنے کے لئے آتا ہے۔ ایک مرتبہ شریفہ ایک ٹھمری گارہی تھی، ضلعدار اور شریفہ کی ماں، صحن میں بیٹھے ہوئے تھے، شریفہ ٹھمری کے ایک بول پر مسکرا دی، اُس پر ماسٹر نے خفا ہو کر کہا :-

شریفہ اگاتے وقت مسکرایا نہیں کرتے، اور ہاں اگاتے ہی پر کیا موقوف ہے، شریف لڑکیوں کو ہر وقت سنجیدہ اور متین بن کر رہنا چاہیئے۔

اس ریاکار ماسٹر کی باتیں سُن کر، بیچاری شریفہ سہم کر رہ گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اُس کے ہونٹوں پر کھینچتی ہوئی مسکراہٹ کو مٹھی میں دبا کر بچان کر دیا۔ شریفہ کے ماں، باپ، ماسٹر کی نصیحت کو سُن کر بہت خوش ہوئے، شریفہ کے سر سے ذرا بھی اتچل ڈھلک جاتا تو ماسٹر اس کو ٹوکتا، اور شریفہ کے ماں باپ کو اطمینان لانے کے لئے اخلاق و آداب کا درس دیتا اور پاکیزگی اور شرافت کا مبلغ بن کر پسند و نصیحت کی باتیں سُناتا۔ شریفہ کے ماں باپ کو اول تو ماسٹر کی طرف سے پہلے ہی اطمینان تھا، دوسرے ماسٹر کے طرز عمل نے اُس اطمینان کو اور زیادہ راسخ اور قوی بنا دیا، تھوڑا بہت وہم اور شبہ جو شمشاد کے کہنے سُننے اور توجہ دلائیے پیدا ہوا تھا، وہ بھی جاتا رہا، اور نہ صرف جاتا رہا، بلکہ اعتماد و یقین کے قالب میں ڈھل گیا۔ ضلعدار اور اُسکی بیوی نے شریفہ اور ماسٹر پر سے ہرگزرائی کو اٹھالیا، وہ اب نہ تو انکی گفتگو سُننے کی کوشش

کرتے تھے، اور نہ ماسٹر کی چال ڈھال پر نگاہ رکھتے تھے۔ شریفہ کا معلم موسیقی تو حرفوں کا بنا ہوا تھا، اُس نے بہت جلد اندازہ لگا لیا کہ شریفہ کے گھر والے اُس پر اعتماد کرتے ہیں، اور اعتماد کا جال بچھانے کے بعد، شکار بچھانے کا وقت آگیا۔ اب وہ دونوں تنہائی میں گھنٹوں باتیں کرتے، اور موسیقی کے علاوہ دوسرے مباحث پر گفتگو ہوتی۔ پہلے شریفہ کسی بات کو تفصیل کیساتھ پوچھتی تھی، تو ماسٹر خفا ہو کر کہتا تھا کہ زیادہ باتیں کرنا ٹھیک نہیں، اور اب وہ شریفہ کی پہل کئے بغیر ہی، گفتگو کو زیادہ سے زیادہ طویل دینے کی کوشش کرتا۔ اس سے پہلے شریفہ کی مسکراہٹ پر ماسٹر رک ٹوک کرتا تھا، اور اب وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور بات میں بات پیدا کر کے ایسے فقرے کہتا کہ وہ نوجوان اور اھلکار کی تھی، سنجیدہ اور مفکر بوڑھے آدمی کو اُن فقروں کو سن کر ہنسی آجائے شریفہ ابتدا میں ماسٹر کی باتوں پر بڑے احتیاط کیساتھ مسکراتی، یہہ رنگ دیکھ کر ماسٹر نے اُس سے کہا کہ مسکراہٹ اور ہنسی سے تندرستی قائم رہتی ہے، ہنس مکہ چہرے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ آدمی کو ہر وقت خوش و خرم رہنا چاہیے، اور کھلانے کھیلنے اور ہنسنے بولنے کا یہی زمانہ تو ہے، اس زمانہ سے آدمی کو خوب فائدہ اٹھانا چاہیے، جو انی نام ہی ہنسی خوشی اور لطیف و مسرت کا ہے۔

ماسٹر کی نئی قسم کی باتیں سن کر، شریفہ کو بہت خوشی بھی وہ تو پہلے ہی سے سنجیدگی اور متانت کی قید و بند کو خیر باد کہنے کے لئے تلی ہوئی تھی، ماسٹر نے شریفہ کو سب سے پہلے بے تکلف کر نیکی کوشش کی، اور اس کوشش میں وہ بہت جلد کامیاب ہو گیا۔ جب شریفہ ہارمونیم بجاتی، تو ماسٹر اسکی انگلیوں کو پکڑ کر، پردوں پر رکھتا، اور اس طرح اُس نے شریفہ کے نازک اور لطیف جسم کو چھو کر، اپنے

خیال میں قریبی رابطہ پیدا کر لیا تھا، ماسٹر، اس معصوم لڑکی کی طرف آہستہ آہستہ
 بڑھ رہا تھا، اور ہر نئی منزل پر پھنچکر وہ اس بات کا اندازہ لگاتا تھا کہ اُس کی باتوں
 اور حرکتوں کو لڑکی کس حد تک گوارا کرتی ہے، جب ماسٹر کی ایک بے تکلفی اور چھڑ
 چھاڑ کا میاں ہو جاتی، تو وہ کچھ اور آگے بڑھ جاتا۔ ہوسنا کی گارہرا اپنا کام کر رہا تھا
 اور معصوم شریفہ اُس زہر کو شربت کے گھونٹ سمجھ کر پی رہی تھی، شریفہ پاکباز تھی
 اور ہوسنا کی کے معاملات میں قطعاً نا تجربہ کار! اُسے کیا خبر تھی کہ ماسٹر اسکی
 انگلیوں کو چھوتے وقت اور کبھی کبھار اُس کے جسم کو ہلکا سا ہٹو کا دیتے ہوئے،
 کس قدر لطف محسوس کرتا ہے، اور اُسکی آنکھیں کس درجہ ہوسناک اور وحشت آلود
 ہو جاتی ہیں، وہ تو یہ سمجھتی تھی کہ یہ سب کچھ صرف تھوڑی دیر کی ہنسی خوشی کیلئے
 کیا جا رہا ہے، وہ ہوسناکیوں کے اُن پھندوں سے قطعاً بے خبر تھی، جو اُس کے
 جذبات کے آس پاس لگائے جا رہے تھے۔

ماسٹر اب شریفہ کو ایسی ٹھہریاں اور غزلیں یاد کرائے لگا، جو عیاں
 اور غیر سنجیدہ مضامین سے لبریز تھیں، شریفہ نے جب پہلی مرتبہ اس شعر کو
 گایا ہے کہ:-

کوئی منہ چوم لے گا اس نہیں پر
 شکن رہ جائے گی باقی جبین پر

تو اُس کے ماتھے پر پسینہ آگیا، اور اُس نے اس شعر کو دہرائے بغیر
 دوسرا شعر شروع کر دیا۔

ارے۔ تم! آج اس قدر بیدلی کے ساتھ

کیوں گارہی ہو، کہ ایک شعر کو دو مرتبہ بھی نہیں کہا،

اور آگے چل دیں _____ ماسٹر نے شریفہ کو

غور سے دیکھتے ہوئے کہا

یہ شعر _____ اونہہ۔ ! اچھا۔ تو۔

اس شعر کو پھر دہراؤں _____ شریفہ نے شرم کر جواب دیا۔

ہاں ! ہاں ! اس شعر کو ایک مرتبہ نہیں،

کئی مرتبہ دہراؤ، گانے میں شرمایا نہیں کرتے۔ !

کتنا اچھا شعر ہے اور تم اُس سے بے پروائی کے ساتھ

گذری جاتی ہو _____ ماسٹر بولا

شریفہ نے تھوڑی دیر گلے بازی کی، اور ہارمونیم پر گنگنائی رہی، ماسٹر نے

بے صبری کیا تاکہ کہا کہ اُسی شعر کو دہراؤ۔

ماسٹر صاحب ! یہ شعر گانے ہوئے، مجھے

نہ جانے کیوں شرم سی معلوم ہوتی ہے، اس شعر کو

رہنے دیجئے میں اس غزل کے دوسرے شعر کئی کئی

مرتبہ گا کر سُنا دوں گی _____ شریفہ نے جواب دیا

شریفہ ! میں تمہارے حجاب ہی کو تو توڑنا چاہتا

ہوں، اس روشن اور مہذب زمانہ میں جبکہ اجو

مہاراجوں اور شریفیوں کی بہو، بیٹیاں، فلم کمپنیوں

میں داخل ہو کر دنیا میں نام پیدا کر رہی ہیں، تم کو

صرف ایک شعر گاتے ہوئے، شرم معلوم ہوتی ہے۔ یہہ
 تم بڑی بوڑھیوں کی سسی باتیں کر رہی ہو۔ اسی شعر کو
 گاؤ، اور بہت دیر تک گاؤ۔ اسی شرم و حجاب
 ہی نے تو مسلمانوں کو اس پست حالت میں پہنچا دیا۔ ماسٹر مارمونیم کو
 چھوٹے ہوئے بولا۔

شریفہ نے، کئی بار کھانا اور پھر ہمت کر کے شعر کو گایا، پہلی مرتبہ تو اسکی
 آواز قدرے گھبرائی ہوئی اور دبی ہوئی نکلی، لیکن ماسٹر کے اُبھار نے، شوق
 دلانے اور تعریف کرنے پر اُس نے اس شعر کو اس قدر مزے کیساتھ دہرایا، کہ
 وہ خود بھی لطف لینے لگی۔ ماسٹر نے چلتے وقت شریفہ کے گانے کی بہت تعریف
 کی، اُس نے کہا کہ ابکی مرتبہ ضلع کی نمائش میں جو سنجی کا جلسہ ہوگا، اُس میں تم کو اول
 انعام دلا کر چھوڑ دنگا، اخباروں میں تمھارے فوٹو شائع ہوں گے، اور ہر جگہ
 تعریف ہوگی شریفہ کا دل باغ باغ ہو گیا، اور اُس نے ماسٹر کا بہت بہت شکریہ
 ادا کیا۔

ماسٹر کی نئی قسم کی باتوں سے شریفہ کو الجھن بھی ہوتی تھی۔ اور ساتھ ہی ہلکا سا
 لطف بھی محسوس کرتی تھی، اُس کے جذبات کے پرسکون اور خاموش دریا میں ہلکی
 ہلکی موجیں کبھی کبھار پیدا ہو جاتی تھیں، اس جدید انقلابات کے داعیات اور
 محرکات اسکی سمجھ میں نہ آتے تھے، جب ماسٹر موسیقی کی تعلیم دیکر چلا جاتا تو وہ گھنٹوں
 اُس کی ہم نشینی اور ہم جلیسی پر تبصرہ کرتی، بعض وقت اُس کے ماتھے پر غنا بے نقر
 کی شدت سے سلوٹیں اُبھر آتیں، کبھی وہ اپنی انگلیوں کو دیکھ کر، مسکرائے لگتی،

آؤ کبھی ”ماسٹر صاحب نے آج کہا تھا کہ تشریفہ تم بہت خوبصورت ہو“ کہہ کر آئینہ میں پہروں اپنے چہرے کو دیکھتی، اور خود ہی اپنے حسن پر تنقید کرتی۔

ماسٹر صاحب نے مجھے خوبصورت کہا، وہ تجربہ کار جہانڈ اور مجھ سے بہت زیادہ عقلمند ہیں، سینکڑوں ہزاروں عورت، مرد، اُن کی نظر سے گزرے ہونگے، اُن کا کہنا جھوٹ تھوڑی ہو سکتا ہے۔ اور یہ تو واقعہ ہے کہ میری جتنی ہجولیاں ہیں اُن میں میرا رنگ سب سے زیادہ کھلتا ہوا ہے، حائدہ کی آنکھوں کی لوگ تعریف کرتے ہیں، مگر میرے رُخساروں کے تل اپنی جگہ لا جواب ہیں، شمیم کا دہانہ بہت چھوٹا ہے، مگر اُس تنگ دہانہ پر لابی تھوڑی کتنی بد نما معلوم ہوتی ہے۔ میرا دہانہ اور تھوڑی دونوں متناسب ہیں۔

آج ماسٹر صاحب نے میری انگلیوں کو چھوتے ہوئے کہا تھا کہ تمہاری انگلیاں بہت ہی لطیف اور نازک ہیں، یہ ماسٹر صاحب! مجھے مغرور بنا کر چھوڑیں گے، مگر ہاں! وہ بھی کیا کریں، آنکھوں سے جو کچھ دیکھتے ہیں، بیان کر دیتے ہیں، دل کی بات چھپانا بھی اچھا نہیں ہیں۔ بڑے مہربان اور خلیق ہیں میرے ماسٹر صاحب۔!

اچھا، یہ ماسٹر صاحب! کچھ دنوں سے زیادہ نے لکھنے کی باتیں کیوں کرنے لگے ہیں، پہلے تو وہ بالکل خاموش بیٹھے

رہا کرتے تھے، اور میرے ذرا سا مسکرا دینے پر اُن کو غصہ آجاتا،
 تھا، مگر اب تو خود ہی چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں، آج تو انہوں نے
 میرے رخسار کو ٹھوکا دیا، میری کلائی کو چھوا، اور میں اگر ہاتھوں
 کو حایل نہ کر دیتی تو شاید وہ میری ران میں چسکی لیکر چھوڑتے
 — ماسٹر صاحب کی یہ باتیں تو اچھی نہیں ہیں، مجھے ابا جان
 سے نہیں تو، امی جان سے ان باتوں کا ضرور تذکرہ کر دینا
 چاہیئے۔

لیکن — امی جان اور ابا جان تو ماسٹر صاحب سے
 بہت زیادہ متاثر ہیں، ماسٹر صاحب کے مقابلہ میں، میری
 بات کب چل سکیگی، مجھے اٹا جھوٹا بننا پڑیگا اور شرمندگی ہوگی
 لاحول ولا قوۃ۔ ! یہہ میں کن بدگمانیوں اور خام خیالیوں
 میں پھنس گئی ہوں، ماسٹر صاحب بہت نیک نفس اور شریف
 ہیں۔ وہ یہہ سب باتیں میرے خوش کرنے کے لئے کرتے ہیں
 اب تو انکی باتوں میں مجھے بھی لطف آنے لگا ہے۔

ماسٹر نے اندازہ لگایا کہ شریفہ ہر چھیڑ چھاڑ اور اذام کو برداشت
 کرتی جا رہی ہے، اب اُس نے تیزی کے ساتھ بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ اب عشق
 و محبت کے ذرا تیز قسم کے قصے، شریفہ کو سنانا، انگریزی رسالوں کے عریاں او
 فحش فوٹو لا کر دکھانا اور بے تکلفی کی حد سے آگے بڑھ کر چھیڑ چھاڑ کرتا۔

لندن کے کسی مصور رسالہ کا ایک فوٹو، (دن ماسٹر، شریفہ

کہ دکھانے کے لئے لیکر آیا، اس تصویر میں یہہ دکھایا گیا تھا کہ ایک نوجوان عورت جس کا سینہ کھلا ہوا تھا، اور رانیں نصف سے زیادہ عریاں تھیں، ایک فٹ مارے کے پاس کھڑی ہوئی تھی، اور ایک مرد پیچھے سے اس کے شانوں کو سہلا رہا تھا، عورت، مرد کے ہاتھوں کے لمس کو محسوس کر کے مسکرا رہی تھی، اور مسکی آنکھوں سے ایک خاص قسم کی مستی اور ربودگی ٹپک رہی تھی۔

شریفہ - اتم نے اس تصویر کو دیکھا
 آرٹسٹ نے اپنا کمال ظاہر کر دیا ہے، _____ ماسٹر فوٹو کو شریفہ
 کے سامنے رکھتے ہوئے بولا

جی۔ ہاں! دیکھا، مگر ماسٹر صاحب، یہہ تو
 بڑی بے شرمی کی بات معلوم ہوتی ہے، ایسی تصویریں
 دیکھ کر میری تو نگاہیں آپ ہی آپ نیچے جھک جاتی ہیں۔ شریفہ نے میز پو
 چھوئے تھے جواب دیا۔

شریفہ - اتم بعض وقت غدر کے زمانہ کی عورتوں
 جیسی باتیں کرنے لگتی ہو، زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ
 گیا ہے، اور تم ہو کہ شرم و حیا کے چکر میں پھنسی ہوئی ہو
 اب شرم و حیا کا پُرانا دستور باقی نہیں رہا، اب تو
 زندگی نام ہی مسرت، خوش فعلی اور ہنسنے بولنے کا ہوا
 اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اور زمانہ کے نقاب
 نے پرانے خیالات اور رجحانات کو بھی بدل دیا ہے،

اب تو عورتیں، مردوں کے دوش بدوش زندگی کی منزل میں کام کر رہی ہیں کتنا ظلم ہے کہ مردوں کو تو ہنسنے بولنے، تفریح کرنے اور لطف اٹھانے کی ہر قسم کی آزادی حاصل ہو، اور عورتیں بیچاری تنگ و تار یک مسکانوں کی چہار دیواریوں میں قیدیوں کی طرح پڑی رہیں، اسی جابرانہ نظام اور ظالمانہ دستور کو، یورپ کی تہذیب نے پارہ پارہ کر دیا ہے، اب عورت آزاد ہے، بالکل آزاد، جذبات میں بھی آزاد اور خیالات میں بھی آزاد!۔ ماسٹر نے انتہائی سنجیدگی کیا تھا۔

ماسٹر صاحب! آپ نے اچھا خاصہ لیکچر دے ڈالا ہاں! صاحب مجھے یہ فلو پسند ہے، آرٹسٹ کو کمال کا کیا کہنا، ہر چیز کو اس قدر واضح طور پر دکھایا ہے کہ کمال کی بیاختہ داد دینی پڑتی ہے۔

مگر یہ عورت مسکرا کیوں رہی ہیں، اسے تو میرے خیال میں ناخوش ہونا چاہیئے۔

شریفہ نے دریا بکھا

جب کوئی مرد، کسی عورت کو محبت اور پیار کے ہاتھ سے چھوٹا ہے تو عورت کو خوشی ہوتی ہے، اور شریفہ! اسی کا نام تو زندگی ہے، محبت کے بغیر زندگی نہ صرف ادھوری بلکہ بے کیف اور روکھی پھینکی بن جاتی ہے،

دیکھو، فوٹو غور سے دیکھو۔ عورت کی آنکھوں کے
پوٹے کیف و مسرت کے مارے کتنے بوجھل ہو گئے ہیں،
اس کی گردن میں کتنا لطیف خم پیدا ہو گیا ہے، ایسا محلو
ہوتا ہے، جیسے مرد اُس کے جسم کو نہیں چھو رہا، بلکہ کوئی

اور تیز سا انجکشن دے رہا ہے۔ ماسٹر نے جواب دیا

ماسٹر نے شریف کو اب بہت زیادہ بے تکلف کر دیا تھا اور اب اس کی گفتگو
کا موضوع عشقیہ افسانے اور اشعار رہتے تھے۔ شریف لاکھ پابکار اور عصمت مآب
سہی، لیکن اس کے پہلو میں جوان دل، جذبات سے لبریز دل اور ذرا سی حرکت میں
بے چین ہو جانے والا دل تھا، گھاس کے تنکے کتنے معصوم ہوتے ہیں، لیکن آگ کی گرمی
پاتے ہی جل اُٹھتے ہیں، ساز کے پردوں کو چھیڑا جائے گا، تو وہ مترنم ہوئے بغیر رہ ہی
نہیں سکتے۔ عورت اور مرد میں جو جنسی اور صنفی کشش پائی جاتی ہے، وہ جب کبھی
ایک دوسرے سے ٹکرائے گی، اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہے گی۔ پھر شریف تو جوانی کی اُس
منزل میں تھی، جس منزل کے زمین و آسمان جذبات ہی جذبات ہوتے ہیں۔ اُسکو
ایک غیر مرد کیساتھ تنہائی کی خوب لائبریری فرحتیں اور اطمینان کے موقع نصیب
ہوتے تھے، موسیقی، شعر، اور عشقیہ افانوں کا ماحول ملتا تھا، تو اُن رنگینوں کو جھبر
میں اُس کو بہر حال آزاد ہو جانا چاہیے تھا۔ ماسٹر ایک بد صورت شخص تھا، اور
اُس میں بظاہر کوئی دلکشی نہیں پائی جاتی تھی، لیکن وہ ناسمجھ لڑکی جو ماسٹر کے ہر اقدام
اور ہر چھٹیڑ چھاڑ پر بہہ محسوس کرتی تھی کہ اُس کے جذبات سے آہستہ آہستہ پر دے
اُٹھ رہے ہیں، اور اُس کو ایک نئی دنیا میں پہنچایا جا رہا ہے، ماسٹر کی خوبصورتی اور

کیا حال ہو رہی تھی پر غور کیا ہی تو جذبات کا سیلاب صحتی اور خوبصورتی کی وانہ کی بنا اور بیکار لطیفہ کشیف میں نفوذ کر جاتی
شریفہ کا باپ وہی ضلعدار جسے شمشاد نے شریفہ کے متعلق بہت کچھ سمجھایا تھا،
زیادہ تر دورے پر رہتا تھا، وہ تو گھر کی باتوں سے بالکل غافل تھا

شریفہ کی ماں نے جب بچھا کہ ماسٹر اور شریفہ اب بہت زیادہ گھل مل کر بات چیت
کرنے لگے ہیں، اور ماسٹر ہفتہ میں کئی کئی دن شہر سے آنے لگا ہے، اور تنہائی میں گھنٹوں بات
چیت ہوتی ہے، تو اُس کا ماتھا ٹھنکا، اور اُس نے شریفہ کو باتوں باتوں میں ٹوٹنا شروع کیا۔
مگر اب شریفہ ماں کی روک ٹوک کی کب پروا کرنے والی تھی نصیحت، ہدایت اور روک
ٹوک کا وقت گزر چکا تھا، شریفہ نے ماں کی باتوں کا سختی کیسا تھ جواب دیا، اور غریب عورت
کو سیکڑوں باتیں سنا ڈالیں۔ شریفہ کی ماں کو ضلعدار کے دورے سے آنے کا انتظار تھا،
ماسٹر سے کچھ کہنے سُننے کی اُس میں ہمت نہ تھی، اور پھر شریفہ کے تیور دیکھ کر، وہ ماسٹر سے اس
سلسلہ میں کچھ کہنا خلافتِ مصلحت بھی سمجھتی تھی۔

ایک دن ماسٹر اور شریفہ بالا خانہ پر بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے، شریفہ کی
ماں ماسٹر سے قدرے بدگمان ہو گئی تھی، وہ دبے پاؤں بالا خانہ پر اچانک پھونچ گئی، اور اُس نے
دیکھا کہ شریفہ آرام کرسی پر لیٹی ہوئی ہے، اور ماسٹر اُس کے بالوں کو سلجھاتے ہوئے کوئی ٹھمری
گا رہا ہے، ماں کو دیکھ کر شریفہ گھبرائے ہوئے انداز میں کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گئی، اور ماسٹر
بھی نہایت ہی لیشمانی اور توحش کے انداز میں بولا۔

”تشریف لائے! بیٹھے! آپ اس وقت کیسے چلے آئیں۔“

شریفہ کی ماں اس منظر کو دیکھ سکتے میں آگئی، وہ بولنا چاہتی تھی، مگر جذبات کی
شدت نے اُس کی زبان کو گنگ کر دیا تھا، وہ بُت کی طرح خاموش کھڑی تھی، لیکن اُس کے

بگڑے ہوئے تیور، غضبناک چہرہ، چشم آلود آنکھیں اور لپکتے ہوئے ہونٹ سب کچھ کہہ رہے تھے، اور اُسکی خاموشی جو کچھ کہہ رہی تھی، اُسے ماسٹر اور شریفہ اچھی طرح سُن رہے تھے اور نہ صرف سُن رہے تھے بلکہ سمجھ بھی رہے تھے۔ بہت دیر تک خاموشی طاری رہی آخر شریفہ کی ماں نے ماسٹر کو مخاطب کر کے کہہ ہی دیا:-

ماسٹر صاحب! یہہ موسیقی کی تعلیم اسی طرح دیجاتی ہے۔

اس ماسٹر نے کچی گولیاں تھوڑی کھلی تھیں جو بوڑھی عورت کے جواب پر سٹ پٹا جاتا اُس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:-

میں شریفہ کو ایک ٹھمری کی دُھن بتا رہا تھا، آپ گانے کے

فن سے واقف نہیں ہیں، مالکوس کا انترہ بہت مشکل ہے

شریفہ کی ماں نے اس پر جھلا کر کہا:-

ہاں! یہہ تو ٹھیک ہے کہ میں گانے سے واقف نہیں ہوں مگر

اس تمھارے ”مالکوس“ کی دُھن میں یہہ قید بھی لگی ہوئی ہے، کہ اُٹاؤ

اپنے شاگرد کے بال سلجھا کر دُھن بتائے۔

اس کے جواب میں ماسٹر بولا:-

قسم خدا کی مجھے اس کا بالکل خیال نہیں ہے کہ میں شریفہ کے

بال سلجھا رہا تھا، ہو سکتا ہے، اور اس کا ایک حد تک امکان ہے، کہ

میں نے بے خیالی میں شریفہ کے بال ہاتھ میں لے لئے ہوں، یہہ موسیقی

فن ہی ایسا ہے کہ تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔

شریفہ کی ماں، ماسٹر کے جواب پر کچھ دیر تک تاؤ کھاتی رہی، اُس کے بعد شریفہ

لی طرف مخاطب ہو کر بولی۔

شریفہ کیا تجھے بھی ماسٹر صاحب کی طرح تن بدن کا ہوش نہ تھا؟

شریفہ نے اس کے جواب میں کہا،

احی! آپ کے سر کی قسم مجھے بالکل خبر نہیں کہ ماسٹر صاحب نے میرے بال چھوئے تھے یا نہیں، میں تو ماسٹر صاحب کی آواز پر کان لگا ہوئے تھی۔ احی جان! آپ آج اس قسم کی باتیں کیوں کر رہی ہیں۔

شریفہ کی ماں! ان لاجواب باتوں کا کیا جواب دیتی، وہ خاموش ہو گئی، اور خاموش نہ ہوتی تو کیا کرتی، جوان لڑکی کے غیر مرد کے سامنے اور غیر مرد سے جوان لڑکی کے روبرو بدگمانی اور شبہ کی بنا پر کچھ زیادہ کہنا سُننا بھی مصلحت کے خلاف تھا، اور جہاں تک زبانی باتوں کا تعلق تھا، اُس میں وہ کسی طرح شریفہ اور ماسٹر سے نہیں جیت سکتی تھی۔ شریفہ کی ماں لالہ پر ہی تھی کہ چھو کرے نے آکر کہا کہ سید صاحب کے گھر کی عورتیں آپ سے ملنے کے لئے آئی ہیں، شریفہ کی ماں یہ سُن کر نیچے چلی گئی، اور ماسٹر اور شریفہ کو تنہائی کا ایک موقع مل گیا۔

احی نے دیکھ لیا تھا۔ ۶۔ _____ شریفہ نے ماسٹر سے

دریافت کیا۔

یقیناً دیکھ لیا تھا، _____ ماسٹر نے جواب دیا

تو اب کیا ہوگا، احی ایک دو مرتبہ دبی زبان سے

بدگمانی کا اظہار کر چکی ہیں، اور آج تو اُن کو پورا یقین ہو گیا

ہوگا _____ شریفہ نے گھبرا کر کہا۔

ہو گا کیا یہی کہ ہم دونوں کی خوب رسوائی ہوگی،
 تمہاری اماں تمہارے ابا سے ذرا سی بات کو، خوب نمک
 مرچ لگا کر بیان کرے گی، اور پھر تمہارے اوپر ایک قیامت
 نازل ہوگی، مجھ پر تو نہ تمہاری امی کا زور چل سکتا ہے، اور
 نہ تمہارے ابا جان میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں، مگر تم تو ان کی بیٹی

ہو، تم پر وہ سختی اور ظلم کا حق رکھتے ہیں۔ ماسٹر تلون کی جیبوں
 میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا

ماسٹر صاحب! خدا کے لئے مجھے رسوائی سے بچاؤ۔ شریفیہ، ماسٹر کے
 کوٹ کو تھام کر بولی۔

رسوائی تو ہو چکی، اب تو اس رسوائی کا جواب دینا ہے، اس کے نتیجے سے بچنا
 اڈوہاں! اگرچہ تو ان مصیبتوں سے بچ سکتی ہو، جو اسی گھر میں، اور
 اسی سرزمین پر تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔

یہہ سچ ہے کہ تمہارے باپ تم کو گھر سے نکال
 نہیں دیں گے، لیکن تم ہر شخص کی نگاہ میں ذلیل بن کر
 رہو گی، اور مجھے تو اس برتاؤ کے تصور سے پسینہ آ رہا ہے
 جو تمہارے ساتھ کیا جائے گا۔ ماسٹر نے جواب دیا۔

ماسٹر صاحب! خدا کے لئے ایسی ترکیب
 بتائیں، جو مجھے مشکلات سے بچا سکتی ہے، اور ہاں!
 آپ نے یہہ کیا کہا کہ ”تم اگر چاہو تو مصیبتوں سے بچ سکتی

ہو، ماسٹر صاحب! میرے ہاتھ میں کیا ہے! میں تو خود
آپکی مہربانی اور عنایت کی پناہ ڈھونڈ رہی ہوں۔ شریفہ گڑا گڑا کر بولی

بتاؤں کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ اور تم کیا کر سکتی ہو!
اچھا سنو! ان تمام مصیبتوں اور زلتوں سے بچنے کی یہی ایک تدبیر ہے
کہ تم اُس مکان کو اور اُن لوگوں کو خیر باد کہہ دو، جہاں تم پر مصیبتیں
نازل ہوں گی، اور جو تم کو پاؤں کی جوتی بنا کر رکھیں گے۔

شریفہ! مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے، محبت ہے، نصیحت
ہے، میں تم کو برباد دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں جس اسکول میں ملازم ہوں،
وہاں میرے لئے بڑے اچھے مواقع ہیں، مگر تمہاری خاطر میں ان تمام
خوش آئند مواقع کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔

کوئی شک نہیں کہ ماں باپ کی محبت اپنے اندر بڑا وزن رکھتی
ہے، اور اُن کی مفارقت بہت تکلیف دہ ہے، مگر مجبوریوں، ناگزیر
حالات اور واقعات کے تحت باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو چھوڑ دیتا ہے
دنیا میں ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں، یہہ کوئی نئی بات
نہیں ہے، اور میں تو کہتا ہوں، جہاں چین ملے، آرام ملے، سکھ
زندگی نصیب ہو، وہی جگہ رہنے کے قابل ہے، وہی میکہ ہے، وہی
سُراں ہے، اور وہی دوستوں، بھولیوں اور ساتھیوں کی بستی ہے،
ہنسی خوشی کی زندگی میں آدمی، ماں، باپ کی مفارقت کے
رج کھوڑا سی دیر میں بھول جاتا ہے، اور تم تو عورت ہو، ایکٹ ایک

دن تمہیں ماں باپ سے بہر حال پچھڑنا ہے، تو پھر جب ایک بات ہو
 بغیر مل ہی نہیں سکتی، تو اُس کے لئے کسی خاص دن اور وقت کا انتظام
 ہی بیکار ہے، جب کہ بہت سی مصیبتیں پریشانیاں اور رسوائیاں
 بھی گھات میں ہوں۔

شریفہ۔! میں تم کو بہت خوش رکھوں گا، تم میرے ساتھ
 بڑے لطف کی زندگی بسر کرو گی، ہم تم یہاں سے سیدھے ممبئی چلیں گے
 وہاں میرے چچا امپرمل بینک میں ملازم ہیں، ان کے توسط سے کوئی
 معقول نوکری مل جائے گی، شریفہ! تم نے ممبئی کا صرف
 نام سنا ہے، وہاں کے رنگین مناظر کو دیکھ کر تم لوٹ ہو جاؤ گی، یہہ
 یہ تم اس نامعقول گاؤں میں پڑی ہوئی انہی اوقات خراب کر رہی ہو۔
 ممبئی میں سمندر کے کنارے جب ہم تم دونوں ہٹلا کریں گے، تو کتنا لطف
 آئے گا۔!

شریفہ۔! اُس خوشی اور اطمینان کا تصور کرو، جب تم
 بہترین موٹروں میں میرے دوش بدوش بیٹھ کر، سیر کیا کرو گی،
 جگہ گاتے ہوٹلوں میں ہم تم دونوں ایک جگہ بیٹھ کر، پیانو سنا کریں گے
 وہاں میں اور تم دونوں آزاد ہوں گے، نہ کوئی روکنے ٹوکنے والا ہوگا
 اور نہ کسی کے کہنے سننے کا خوف، جہاں دل میں آئیگا، جائیں گے
 اور جس سے چاہیں گے، ملیں گے، کتنی پرلطف اور اطمینان بخش
 ہو گی وہ زندگی۔! اور۔

تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے

شریفہ بے صبری کیسا تھ

بات کاٹتے ہوئے بولی

اتنا کچھ سمجھانیکے بعد بھی، تم پوچھتی ہو کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے، معلوم ہوتا ہے کہ خوف اور پریشانی نے تمہارے ہوش، حواس کو متاثر کر دیا ہے، میرا خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ تمہاری امی، کسی نہ کسی آدمی کو تمہارے ابا کے پاس بھیج کر، اُن کو ضرور بلا لیں گی، تمہاری امی کے تیور بہت ہی خوفناک قسم کے تھے۔ !

شریفہ۔ ! دیکھو، تھوڑی تاخیر بھی، بہت سی مشکلات اور پریشانیوں کا باعث ہو گی، بس تم آج رات میں، جس طرح ہو سکے، اس گھر کو چھوڑ دو، اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ میں بازار کے نکل دو، گلی میں تم کو کھڑا ہوا ملوں گا، تم وہاں رات میں جب سب لوگ سو جائیں تو آجانا۔ میں سواری کا انتظام کر رکھوں گا سواری میں بٹیکر اسٹیشن پہنچ جائیں گے، اور وہاں سے سیدھا بمبئی کا ٹکٹ لیں گے دیکھو۔ ! گھبرانا نہیں، گھبراہٹ سے بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے، ذرا ہوشیاری اور اطمینان کیساتھ اس کام کو کرنا۔ اس قصبہ کی گلیوں میں تو رات کے نو بجے کے بعد سناٹا ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں گیارہ بجے کے بعد، تم بے دھڑک اپنے گھر سے روانہ ہو سکتی ہو، اس وقت

گھر کے آدمی بھی سب گہری نیند سوتے ہوں گے۔ ماسٹر شریفہ کا

ہاتھ مسکراتے ہوئے، ختم کر بلا

بہت اچھا — میں ضرور —

شریفہ نے دوچار لفظ ہی کہے تھے کہ نیچے سے اُس کی ماں نے آواز دی اور شریفہ بالا خانہ سے اُتر کر صحن میں چلی گئی۔ ماسٹر، اپنی پوری اسکیم شریفہ کے سامنے پیش کر چکا تھا، اور شریفہ نے اُس اسکیم کی ایک ایک تجویز سے اتفاق کر لیا تھا، اس لئے ماسٹر بہت خوش تھا، اور مستقبل کا زنجین تصور اُس کے خیالات کو خوشی کا جھولا جھلارہا تھا۔

فرار

ماسٹر، شریفہ کے مکان سے روانہ ہو کر، اپنے ایک جلنے والے کے یہاں پہنچا۔ اور دن چھپے وہاں سے قصبہ کے باہر ایک دھرم شالہ میں چلا گیا۔ اس دھرم شالہ کی عمارت تو زیادہ بڑی نہ تھی، مگر اس کا باغ قیصر پور کی آبادی کو دیکھتے ہوئے۔ بہت لالبا چڑا اور شاداب تھا۔ بے ترتیب روشوں پر مہندی اور کنیر کے پودے اور کیا ریوں میں لگینے چنبیلی اور گلاب کے پھول بہت بھلے معلوم ہوتے تھے، دھرم شالہ کے چبوترے پر دو چال سادھو ہر وقت بھبوت ملے بیٹھے رہتے تھے، دھرم شالہ کا چبوترہ چند اور سلفے کے پینے والوں کے لئے مشہور تھا، جب ماسٹر دھرم شالہ میں پہنچا ہے، تو ایک مشنڈا سادھو، سلفے کے دم لگا رہا تھا، ماسٹر کو دیکھتے ہی سادھو چلا کر بولا:۔

— جا! کہہ دیا، کام ہو جائے گا، ضرور ہو جائے گا۔

— آج ہی ہو جائے گا۔

سادھوؤں اور فقیروں کے، اس قسم کے فقرے سٹینٹ ہوتے ہیں، مگر جب آدمی کے دل میں چور ہوتا ہے، یا کوئی مشکل اور غرض درپیش ہوتی ہے، تو وہ فقیر کی بڑے کو غیب کی آواز سمجھا جاتا ہے، ماسٹر سادھو کے پاس عقیدت کیساتھ بیٹھ گیا، ماسٹر کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا، کہ یہ سادھو سچ مچ خدا رسیدہ ہے، اور دل کی بات چہرہ پر نظر ڈالتے ہی بتا دیتا ہے، سادھو جب خوب سلفے کے دھوئیں اڑا چکا، تو اُس نے چلم، الاؤ کے کنارے پر رکھ دی، اور انگوچھے سے اپنی اُلجھی ہوئی ڈاڑھی کو پونچھنے لگا، ماسٹر نے جیب میں سے ایک روپیہ نکال کر، سادھو کی ”بارگاہ بے نیاز“ میں پیش کیا، اور سادھو نے یہہ کہتے ہوئے کہہ دیا: اس کی کیا ضرورت ہے، روپیہ لے لیا۔

شریفہ نے گھر سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا، گھر کے کسی کام میں اُس کی طبیعت نہ لگتی تھی، اور اُس پر ایک عجیب قسم کی وحشت اور بدحواسی طاری تھی، شریفہ کی ماں نے باہر سے آئی ہوئی عورتوں کے کیواسطے، پان بنانے کے لئے کہا تو شریفہ نے بے خیالی اور وحشت میں سروتہ سے انگلی کاٹ لی، اور پانوں کا کپڑا ہون میں تر بتر ہو گیا، ایک عورت نے اپنے رومال سے دھجی پھاڑی، اور پانی میں بھگو کر، شریفہ کی انگلی پر باندھ دی۔ عورتوں کے لئے چائے بنائی، تو بعض پیالیوں میں پانچ پانچ چمچہ چمچے شکر جھونک دی، اور بعض پیالیوں کو شکر کے چمچہ سے بھی نہ چھوا۔ عورتوں میں چائے پر بہت مذاق رہا، اور سب نے اس کو شریفہ کے لڑکپن پر محمول کیا۔

شریفہ کی چال میں بھی ایک خاص قسم کی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی، وہ اس طرح چلتی تھی، جیسے کوئی اس کے تلواروں میں گدگدی کر رہا ہے، اور وہ قوت کیساتھ زمین پر پیر نہیں رکھ سکتی، شریفہ کی ماں، بیٹی کی اس تبدیلی اور وحشت کو خوب اچھی طرح

۱۲۲
محسوس کر رہی تھی، اور اُس کا خیال نہیں بلکہ یقین تھا، کہ آج کے واقعہ نے شریفہ کو بہت متاثر کیا ہے، اسمیٰ کے سبب شریفہ سے ایسی مضطربانہ حرکتیں ظہور آ رہی ہیں، تو ایسی صورت میں، جبکہ شریفہ کی ماں کے خیال میں، شریفہ خود ہی حد سے زیادہ نادام اور پشیمان ہو رہی تھی، اس کو کسی بات پر ٹوٹنا، یا کچھ کہنا سنا ٹھیک نہ تھا اُس غریب کو کیا معلوم تھا کہ اُس کے جگر کا ٹکڑا آج بغاوت پر آمادہ ہے، اور سمیٹتی کے سریلے نغمے اپنا اثر دکھا رہے ہیں۔

شریفہ نے رات میں کچھ یوں ہی سا کھانا کھا لیا، وہ بہت سویرے بستر پر لیٹ گئی اور بہت دیر تک آنکھیں بند کئے پڑی رہی، ماں، باپ کی جدائی کا تخیل رہ رہ کر اُس کے سنگین ارادے میں تزلزل پیدا کرتا تھا، لیکن جب ماسٹر کی کہی ہوئی باتیں یاد آتی تھیں، تو وہ اپنے عزم میں غیر معمولی قوت محسوس کرتی تھی۔ اُس نے ماسٹر کیساتھ فرار ہونے کا پلنگ پر لیٹے لیٹے اگرچہ فیصلہ کر لیا تھا، مگر ماں باپ کی جدائی اور نئی زندگی کے عواقب و نتائج کے تصورات اب بھی اُس کے تفکر کا دامن تھامے ہوئے تھے، اُس کے خیالات اس کی شکست کے طوفان میں جھکولے کھارے تھے کہ گھڑی نے ٹن ٹن کرنا شروع کیا، اور جب گھنٹہ کی آواز بند ہوئی ہے، تو وہ آہستہ سے بولی :-

”دس بج گئے۔ یعنی گیارہ بجنے میں“

”صرف ایک گھنٹہ باقی ہے۔“

اُس نے چادر کو چہرے سے اٹھا کر دیکھا تو سارے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا، اُس کی ماں قریب کے کمرے میں خراٹے بھر رہی تھی، اماں کا چھوٹا بچہ، برآمدے میں ہنک رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ ماں کا دودھ پی رہا ہے۔ شریفہ پلنگ

پلنگ سے اٹھی، اور اُس نے دبے پاؤں، مکان کا ایک چکر لگایا، سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے، اُس طرف سے اطمینان ہو گیا، تو اُس نے اپنے کمرے میں جا کر اپنے ٹرنک کو کھولا، اور لباس تبدیل کیا، اُس نے فرار کا پکا ارادہ کر لیا تھا، اور اس ارادے نے اُس میں ایک قوت سی پیدا کر دی تھی، مگر اس بالکل نئے تجربہ نے اس غیر محسوس طور پر متوحش بنا دیا تھا، اسی توحش اور گھبراہٹ کا اثر تھا کہ کئی منٹ میں وہ قمیص پہن سکی، ایک آستین ہنتی تھی، تو دوسری آستیں گھبراہٹ میں نہ ملتی تھی، اور جب دونوں آستین باہوں میں آگئیں، تو سرگرمیاں میں پھنس گیا، شریفہ کی ماں کا کمرہ بالکل قریب تھا، اس لئے کپڑوں کی سرسراہٹ اور سانس کی تیزی کو روکنے اور چھپانے کی بھی اُسے کوشش کرنا پڑ رہی تھی۔ اُسکی ماں نے نیند ہی میں، کڑ لی اور کڑ بدلتے میں، اُسکی کلائی کا کڑا، مسہری کی پٹی سے بٹرایا، شریفہ سمجھی کہ اُسکی ماں جاگ پڑی، وہ چور کی طرح سہم کر، اُسی حالت میں پلنگ پر لیٹ گئی، اور کئی منٹ تک سانس کو روکے ہوئے خاموش پڑی رہی، اُسکی ماں تو خوب گہری نیند سو رہی تھی، اُس کے خراٹوں کی آواز سن کر، شریفہ پھر اٹھی اور جلدی سے ساڑی بیکر بڑھتے پہن لیا۔ کمرے سے چلتے وقت اُس نے اپنی ماں کے کمرے میں جھانک کر دیکھا، شریفہ کی ماں کا چہرہ آدھا چہرہ کھلا ہوا تھا، ماں کے چہرے کو دیکھ کر اُس کی پلکیں نم آلود ہو گئیں، ماں کی محبت نے پاؤں کو بھاری بنا دیا، مگر فرار کے بعد کے زنگین اور خوش آئند مستقبل نے اس کے دبے ہوئے جذبہ کو تیزی کیساتھ ابھارا۔ اور وہ ماں کے چہرے پر آخری چٹپٹی ہوئی نگاہ ڈال کر، کمرے سے باہر آگئی۔ ماما بچہ کو سینہ سے چمٹائے ہوئے۔ برآمدے میں سو رہی تھی، اور اُس کے اُلجھے ہوئے بال خاک پر بکھرے ہوئے تھے، وہ صحن میں پہنچی

چاندکی بارہویں تاریخ تھی صحن میں دودھ سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی، صحن کی ایک ایک چیز خوب صاف دکھائی دیتی تھی، وہ صحن سے گزر کر، ڈیوڑ میں آئی، اور اس آخری منزل پر اگر وہ ٹھٹک گئی، شریفہ کے باپ کا وفادار ملازم، کمال خاں ڈیوڑ ہی میں سو رہا تھا۔ کمال خاں پر ضلعدار کو بہت زیادہ اعتماد تھا، اور وہ اپنے گھر کو کمال خاں پر چھوڑ کر دورے پر ہفتوں اور مہینوں باہر ہا کرتا تھا۔ کمال خاں کی عمر ساٹھ کے قریب تھی، مگر اس بڑھاپے میں بھی، اچھے اچھے جوانوں کو شرماتا تھا، کسرتی جسم، طباق سا چہرہ، گھنی ڈاڑھی، خوب بھرے ہوئے شانے، ڈھیلہ کرتہ پہن کر اور سر پر منڈاسہ باندھ کر، اچھا خاصا دیولوم ہوتا تھا، کمال خاں کا پلنگ صدر دروازے کے قریب بچھا ہوا تھا، اور پلنگ کی پٹی سے، لانا سا لٹھر رکھا ہوا تھا، طاق میں مٹی کا چراغ ٹمٹمارا ہوا تھا، اور پچھم کی طرف کے کونے میں بکریاں بندھی ہوئی تھیں، شریفہ برقعہ میں لیٹی ہوئی تھی، تھوڑا سا چہرہ کھلا ہوا تھا، بکریوں نے اس کو دیکھ کر، چمکنا شروع کیا، اور کھڑوں کوزمین پر مارے لگیں، کمال خاں نے "اع، عا" کرتے ہوئے، اس طرف کروٹ لی، جس طرف شریفہ کھڑی ہوئی تھی، شریفہ ڈر کے مارے، دیوار سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی، کمال خاں کا لٹھ، اور اُس کا چہرہ شریفہ کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں بکریوں کے کھڑوں کی آواز سن کر کمال خاں چونک نہ اٹھے، اُس نے ہمت کر کے چراغ کو گل کر دیا، اور ڈیوڑ ہی میں ایک ایک اندھیرا پھیل گیا۔

شریفہ دبے پاؤں، دروازے پر پھونچی، اور بہت ہی آہستگی کیساتھ دروازہ کھولا، اور وہ تیزی کیساتھ مکان کے باہر ہو گئی، قیصر پور کی گلیوں میں سنناٹا چھایا ہوا تھا، کہیں سے ایک ہلکی سی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے

اس قصبہ کے رہنے والوں کو کسی نے کوئی تیز سانشہ پلا کر، غفلت کی نیند سلا دیا ہو، شریفہ کو گلیوں میں دو چار جگہ کتے ملے، جو حسبِ عادت زور زور سے بھونکنے لگے، شریفہ کا سینہ خوف کے مارے اوپر نیچے ہو رہا تھا، اور اُس کے پاؤں لٹکھڑاتے ہوئے پڑ رہے تھے۔ تھوڑی سی دیر میں وہ اُس نلکڑ پر پھونچتی جہاں ماسٹر اُس کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ چاندنی میں خوب دور تک کی چیز دکھائی دیتی تھی، ماسٹر نے شریفہ کو بہت دُور سے پہچان لیا، اور آگے بڑھ کر شریفہ کے پاس پہونچا، اور انتہائی ہمدردی کے لہجہ میں بولا۔

شریفہ! تم آگئیں۔ میں تو نو بجے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

شریفہ نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا:۔
آپ کو زبان دے چکی تھی، بھلا کیسے —

نہ آتی — !

ماسٹر نے، شریفہ کی گھبراہٹ کو دور کرنے کے لئے کہا کہ اب گھبرائے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میں نے سب کچھ انتظام کر لیا ہے، بس ذرا اسٹیشن روڈ تک پہونچنے کی دیر ہے، پھر ہم ہر خوف اور خطرے سے آزاد ہیں۔ اسٹیشن روڈ، بازار کے نمڑ سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر تھی، معمولی رفتار سے صرف چند منٹ کا راستہ تھا، لیکن گاؤں اور قصبہ کے کتے بھی، شہر کے کتوں کے مقابلہ میں ذرا ”باحیمیت“ اور جنگجو یا نہ اسپرٹ کے ہوتے ہیں، کہ ذرا پتہ کھڑکا، اور انھوں نے ایڑی، چوٹی کا زور لگا کر ”بھوں، بھوں“ کرنا شروع کر دیا۔ ایک کتے نے ذرا ”عوعو“ کیا کہ دوسرا کتا بھی اپنے

بھائی کی ہمدردی میں اُس کا ہم نوا بن گیا، اب یہ سلسلہ قائم ہونا چلا گیا، یہاں تک کہ گاؤں کے قریب قریب تمام گتے ایک ہی آواز اور لہجہ میں بولنے لگے، اور بعض بعض گتے تو اس قوت کیساتھ چلاتے تھے، گویا کہ ”سارے جہاں کا درد“ اسی کے جگر میں بھرا ہوا ہے۔

بعض کمزور اور سنجیدہ قسم کے گتے، اپنے بھائی بندوں کی ہمدردی میں بس ایک آدھ مرتبہ ”عف“ کر کے رہ جاتے ہیں۔ مگر بعض پتلی دلی گتیاں، اس زور اور قوت کیساتھ بھونکتی ہیں کہ انگریزی کونسلوں اور اسمبلیوں کے رٹا کو ارکان بھی، ان کو دیکھیں تو شرمنا جائیں۔ گاؤں اور قصبوں کی راتوں کا سکوت بھی کتے توڑتے رہتے ہیں، اور ان ہی آوازوں چلت، پھرت سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہاں زندہ لوگ بہت ہیں، ماسٹر اور شریف کو دیکھ کر، کتوں نے حشر برپا کر دیا، ماسٹر کتوں کو بار بار دھمکتا تھا، مگر کتے کہیں ان دھمکیوں کی پروا کر نیوالے تھے، وہ ان دونوں کا برابر تعاقب کئے چلے جا رہے تھے، جہاں ایک گلی ختم ہوئی تو، اس گلی کے گتے، دوسری گلی کے کتوں کے چارج میں ماسٹر اور شریف کو دیکر، رخصت ہو گئے، ”چارج“ اور ”ڈسچارج“ کا سلسلہ سوت تک باقی رہا، جب تک یہ دونوں تانگہ میں سوار نہ ہو گئے۔ کتوں کے اس بے ہنگام خل و معقولات کے باعث، ماسٹر اور شریف، بہت دیر میں اسٹیشن روڈ پہنچے۔ تانگہ والا کوچ پر بیٹھا ہوا، چلم پی رہا تھا، ماسٹر کو دیکھتے ہی وہ تانگہ سے اتر، شریف اور ماسٹر تانگے میں سوار ہوئے، تانگہ والے نے لگام کو جنبش دی، اور گھوڑا فرٹے بھرنے لگا، اسٹیشن روڈ کے دونوں طرف سایہ دار درخت تھے، جن کی گھنی چھاؤں نے سڑک کو چاندنی کے اُجالے سے محروم کر دیا تھا، ماسٹر اور شریف پھلی سیٹ پر

خاموش بیٹھے ہوئے تھے، تا نگہ والا راستہ کاٹنے کے لئے، جو کچھ اُسے یاد تھا مرنے لے لیکر گارہا تھا۔ گھوڑے کے پاؤں کی آواز اور تانگے والے کی غزلیں اور ٹھمریاں مل جُل کر، سناتے کو چونکار رہی تھیں، یہہ دونوں بالکل خاموش تھے، ایک مرتبہ شریفی کی زبان سے چند لفظ ادا ہوئے کہ:-

— ماسٹر صاحب! ذرا سنبھل کر بیٹھیے۔ دیکھیے

— تو —

ہوسنا کی اور بے صبری ملی جلی کیفیتوں کا نام ہے، ہوس پرست انسان بڑا ہی جلد باز ہوتا ہے، اور یہی ”بے صبری“ اُس کے بہت سے بھیدوں کو طشت از بام اور بہت سی اسکیموں کو تباہ کر دیتی ہے۔ ماسٹر بھی ان لمحات سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، اور وہ سمجھتا تھا کہ شریفہ اُس کے قبضہ میں ہے، اور وہ اُس پر ہر طرح کا حق رکھتا ہے، شریفہ کے اس جملہ پر، ماسٹر کھسیا نا ہو کر کہنے لگا:-

”شریفہ! مجھے نیند کے چھوٹے آرہے ہیں“

”شاید بے خیالی میں تمہارے شانے میں نے“

”چھوٹے“

تھوڑی دیر تک تو ماسٹر خاموش بیٹھا رہا، لیکن ہوسنا کی، کہیں جذبات کو نچلا تھوڑی بیٹھنے دیتی ہے، وہ آہستہ آہستہ شریفہ کے قریب کھسک کر گیا اور اپنے جسم کو، شریفہ کے بدن کے بالکل قریب لے آیا، شریفہ نے اپنے بدن کو بہت کچھ چڑایا، اور سکیڑا، مگر تانگہ میں گنجائش ہی کتنی ہوتی ہے، ماسٹر اس کی طرف کھسکا ہوا چلا آ رہا تھا، اور اُس کی سانس خوب تیزی کیساتھ چل رہی تھی۔

ماسٹر صاحب! آپ یہہ کیا کر رہے ہیں،
میں آپ کو ایک مرتبہ ٹوک چکی ہوں ————— شریفہ نے کہا۔

شریفہ! تم آج اکھڑی ہوئی سی باتیں کر رہی
تم اتنی شرماتی کیوں ہو، یہاں دیکھنے والا کون

ہے، تانگہ دلاتو اپنے گالے میں مصروف ہے ————— ماسٹر نے جواب دیا۔

یہاں دیکھنے والا کون ہے، اس سے آپ کا
مطلب کیا ہے، یہہ تو آپ آج، نئی قسم کی باتیں کر رہے ہیں شریفہ، تانگے
کے ڈنڈے پر ہاتھ کاڑو
دیتے ہوئے بولی۔

باتیں تو نئی نہیں ہیں، آج تم ہی کچھ نئی بن گئی
ہو، ان ہی باتوں کے لئے تو میں تم کو ان بندھنوں اور
پابندیوں سے چھڑا کر لایا ہوں، اب تو ہم کو ایک دوسرے
کیساتھ، انتہائی بے تکلفی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔

اور ہاں! جو ہاتھ تمہارے بالوں کو چھو چکے
ہیں، وہ تمہارے رخسار چھونے کا بھی حق رکھتے ہیں،
اس جرات اور جسارت کی تخلیق میں تم نے بڑی جلد
حصہ لیا ہے، شاید! تم خوف اور گھبراہٹ کے سبب ایسا
کر رہی ہو، لیکن ڈر، گھبراہٹ اور احتیاط کی سرحد
ختم ہو گئی، اب تو تم ”تبادلہ جذبات“ کی آغوش میں

ہو، وہاں، جہاں مرد اور عورت بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ ماسٹر نے شریفہ کی

طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا

ماسٹر کی دست درازی پر شریفہ کا ماتھا ٹھنکا، غصہ اور غیرت کے اثر سے اُس کا

سینہ اوپر نیچے ہونے لگا، تھوڑی دیر میں اسٹیشن آگیا، اور دونوں تانگوں سے اتر کر پلیٹ فارم

پر چھوٹے قبیلہ پور روڈ اسٹیشن، بہت ہی چھوٹا اسٹیشن تھا، دفتر کے دو کمرے، تیسرے درجہ کا

چھوٹا سا مسافر خانہ، بابوؤں اور ادنیٰ ملازمین کے رہنے کے لئے چند کوارٹر، بس یہی اسٹیشن

کی کائنات تھی۔ اسٹیشن پر سناٹا چھایا ہوا تھا، دو چار مسافر پلیٹ فارم پر پڑے ہوئے، سڑک

تھے، حلوائی کی دوکان پر جو اسٹیشن ہی کے کپاؤں میں تھی، ٹمٹماتا ہوا چراغ جل رہا تھا، اسٹیشن

کا پہریدار حلوائی کی دوکان کی بھٹی پر بیٹھ کر حقہ پی رہا تھا۔ گاڑی کے آنے میں ابھی ایک

گھنٹہ باقی تھا۔

ماسٹر نے شریفہ کا ہاتھ ختم کر کہا کہ چلو، پلیٹ فارم کے کھلے ہوئے حصہ پر بیٹھیں گے

ابھی گاڑی کے آنے میں ٹائم ٹیبل کے لحاظ سے ایک گھنٹہ باقی ہے، اور اس لائن پر تو گارڈ

عام طور پر لیٹ ہو جاتی ہیں۔ شریفہ نے کہا کہ مجھے تو وہاں تنہائی میں ڈر لگتا ہے، یہ اسٹیشن تو

بالکل جنگل میں واقع ہے، جس طرف آپ بیٹھنے کے لئے کہہ رہے ہیں، اُس طرف جنگل

ہی جنگل ہے، آپ دیکھتے نہیں ہیں، کتنی گھنی جھاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں، پچھلی برسات

کا قصہ ہے کہ ایک سا ہو کار کو اس اسٹیشن پر ڈاکوؤں نے لوٹ لیا، اس اسٹیشن کو تو میں ہر وقت

خطرے میں سمجھتی ہوں، اب اس وقت مسافر اور دوکاندار سب مل ملا کر مشکل سے

پندرہ ہونگے، وہ بھی سب تھمے، اب ایسے میں اگر تین چار آدمی بھی چھوٹی بندوق یا نمونے

ستول لیکر آجائیں تو کس کی ہمت ہے جو ان کا مقابلہ کر سکے۔ ماسٹر اسرار کرتا رہا،

اور شریفہ اس کی ہر بات کو مانتی رہی، اور وہ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے سامنے دری بچھا کر بیٹھ گئی۔ کوئی ایک گھنٹہ کے بعد تارکھ میں گھنٹی بجی، اور پہریدار نے ”رات بابو“ کو جوتڑ کی میز پر سوراہا تھا، جگایا کہ تارکھ میں گھنٹی بج رہی ہے۔ بابو ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا، اور اسی حالت میں کہ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی، اور گریبان کھلا ہوا تھا، اس نے تارکے آلہ پر ہاتھ رکھ دیا، اور کچھ دیر بعد پر زور آواز سے بولا:-

”گاڑی چھوڑ دی گئی، گھنٹی بجاؤ“

پہریدار نے گھنٹی بجائی، مسافر گھبرا کر اٹھے، اور ذرا سی دیر میں ٹکٹ لیکر پلٹ فارم پر آگئے۔ ماسٹر نے اپنا اور شریفہ کا بھی ٹکٹ لیا، اور یہہ دونوں سگنل کے قریب کی بج پر اپنا مختصر سا سامان لیکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں گاڑی آگئی اور یہہ دونوں ایکٹ میں سوار ہو گئے۔ ماسٹر نے شریفہ کے تیور دیکھ کر، چھپر چھپر کا سلسلہ بالکل بند کر ڈیا تھا، اور وہ اپنے دل میں اپنی عجلت اور بے صبری پر خود پشیمان تھا۔

پکڑے گئے

شریفہ راستے بھر خاموش بیٹھی رہی، ماسٹر نے بھی بات چیت کرنا مناسب نہ سمجھا، کوئی ڈیڑھ گھنٹہ میں عظیم گنج جنکشن آگیا، اور مسافروں نے گاڑی کو خالی کر دیا۔ قیصر پور کا ضلع عظیم گنج تھا، اور اسی جنکشن سے ممبئی کے لئے گاڑی ملتی تھی۔ اس جنکشن سے دو لائینیں جاتی تھیں، جنکشن کی عمارت تو معمولی تھی لیکن مسافروں کا ہر وقت ہجوم رہتا تھا۔ شریفہ اور ماسٹر، ٹرین سے اتر کر تیسرے درجہ کے مسافر خانہ میں پھونچے۔ مسافر خانہ

اسٹیشن کی اصل عمارت سے چند قدم کے فاصلہ پر تھا، اس عمارت میں کافی گنجائش تھی، دو ہزار سے کچھ زائد مسافر، بہ یک وقت آرام کیساتھ بیٹھ اٹھ سکتے تھے۔ مسافر خانے کے ایک حصہ میں پان، سگریٹ میوے اور مٹھائی کی دوکانیں تھیں، اور بالکل بیچ میں تیسرے درجہ کا کھٹ گھر تھا۔ اس جنگشن پر قیصر پور کے آنے والے، ہر ٹرین کے وقت موجود رہتے تھے، اس لئے ماسٹر نے شریفہ کو زمانہ ویڈنگ روم میں بھیج دیا۔

جب شریفہ اور ماسٹر عظیم گنج جنگشن پر پھونچے ہیں تو صبح کے ساڑھے چار کا

وقت تھا،

مبئی کے لئے دن کے نو بجے ایکسپریس ملتا تھا، اور قیصر پور روڈ اسٹیشن کو ساڑھے چھ بجے گاڑی جاتی تھی، شمشاد کلکٹری کچہری میں کسی کام سے آیا ہوا تھا، اور اتفاق کی بات کہ شریفہ کا باپ ضلعدار بھی صبح کی ٹرین سے طویل دورے کے بعد، قیصر پور کو واپس ہو رہا تھا۔ شمشاد سرائے سے، بہت سویرے اٹھ کر، اسٹیشن چلا آیا، اور یہیں آکر، اُس نے صبح کی نماز ادا کی، نماز پڑھنے کے بعد، وہ بگنگ آفس کے سامنے بیچ پر بیٹھ گیا۔

ریلوے مسافر خانے حقیقت یہہ ہے کہ "نفیات کی زندہ تاریخیں" ہیں، مختلف طبایع اور کردار کے لوگ بہ یک وقت نظر آتے ہیں۔ اور اگر کوئی حساس اور زندہ دل آدمی، مسافروں کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرے، تو کاغذوں پر لکھے ہوئے افانوں سے بہت زیادہ لطف حاصل ہو۔ مسافر خانوں کے صبح و شام اور راتیں افانوں اور ناولوں کے نئے نئے خاکے اور نظموں کے موضوع پیش کرتی رہتی ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ اس زندگی اور چہل پہل فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بات یہہ ہے کہ اول تو ہر مسافر عام نفیات کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، دوسرے جو

لوگ ذرا بلند نظر ہوتے ہیں، وہ مسافروں کیساتھ کھل مل کر ”مسافر“ بن جاتے ہیں، مسافر خانوں کی زندگی کا وہی شخص صبح لُطف اٹھا سکتا ہے جو صرف تماشا کی کی حیثیت سے، لوگوں کو بڑھنے کی کوشش کرے، بالکل فلوں کے دیکھنے والوں کی طرح۔ اگر آدمی مسافر خانوں کے ایٹج پر اگر خود بھی ایکٹر بن گیا، تو پھر وہ ”تماشے“ کا لُطف نہیں اٹھا سکتا آدمی ایک ہی وقت میں اداکار اور تماشا ئی نہیں بن سکتا۔

عظیم گنج جنگشن پر بڑی چہل پہل نظر آ رہی تھی، رات کا اندھیرا صبح کی سبیدی میں گم ہو چکا تھا، اور سورج کی ہفیرا کر نہیں، ٹین کے شیڈ اور درختوں کے پتوں کو چوم رہی تھیں۔ ریلوے ملازمین نے، گیس کے ہنڈوں اور لالٹینوں کو گل کر دیا تھا، مسافر جلدی جلدی ہاتھ مٹہ دہور رہے تھے، مٹھائی کی دوکانوں پر کٹے دو لے چاٹ رہے تھے اور صلوائی پھرتی کیساتھ گرم گرم جلیبیوں کی تیاری میں مصروف تھے، پنواڑی اپنی تھالیوں کو صاف کر کے، پان اور سگرٹ سلیقہ کیساتھ رکھ رہے تھے، بعض لوگ کٹھ گھر کی کھڑکی پر، اس طرح کھڑے ہوئے تھے، کہ ایک ہاتھ میں ٹوٹا تھا، اور دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں کٹھ کے پیسے تھے، ٹرین کے آنے میں ابھی دیر تھی، مگر یہ لوگ بے تاب ہو ہو کر کہتے تھے

بابو جی! کٹھ دیجئے۔ گاڑی آنیوالی ہے،

اٹھئے، آپ تو گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں۔

ہم آپ کی کاہلی کی صاحب کو رپورٹ کر دیں گے۔

خونچے والے اپنے مخصوص انداز میں آوازیں لگا رہے تھے،

گرم جلیبیاں، دال موٹھ، کچالو

گندیریاں سستی کر دیں، تازہ میوہ، بادام کا حلوہ۔

علی گڑھ کے بسکٹ، متھرا کا کھرچن —

شمشاد بیچ پر بیٹھا ہوا اس منظر سے لطف اٹھا رہا تھا، اس پورے مجمع میں شاید ہی شخص اس تماشے کو دیکھ رہا تھا، اور سب تو اداکاری میں مصروف تھے۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر جو مسافر کھڑے ہوئے تھے، اُن میں سے ایک مسافر کا پیر کتے پر پڑ گیا، کتا اُٹھ کر بھاگا، اور مسافر دھڑام سے فرش پر گر پڑا، سب لوگ ہنسنے لگے، تو شمشاد اس طرف متوجہ ہو گیا، شمشاد نے دیکھا کہ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے قریب، ضلع دار کی لڑکی شریفہ کو موسیقی سکھانے والا ماسٹر کھڑا ہوا، ٹایم ٹیبل دیکھ رہا ہے، شمشاد نے اُس کو آواز دی مگر وہ اس قدر محو تھا کہ شمشاد کی آواز کو نہ سُن سکا، شمشاد اُس کے پاس اُٹھ کر جانا چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے سیدھا، زنانه وٹینگ روم کے دروازے پر پہنچا، اور شریفہ سے باتیں کرنے لگا۔ باتیں کر نیکے بعد ماسٹر، ستون کی آڑ میں، بیچ کے کونے پر بیٹھ گیا، اور تھوڑی سی دیر میں کئی مرتبہ زنانه وٹینگ روم کے دروازے پر آیا گیا، ماسٹر، کچھ گھبرا یا سا نظر آتا تھا، اور وہ وٹینگ روم کے دروازے پر عورت سے باتیں کر نیکے بعد فوراً ہی ستون کی آڑ میں جا کر بیٹھ جاتا تھا۔

ماسٹر کے انداز، اگرچہ شبہ میں ڈالنے والے تھے، مگر شمشاد نے اس کو شک و شبہ کی نگاہوں سے نہیں دیکھا، وہ بالکل خالی الذہن تھا، عام طور پر پردیس میں کسی اجنبی مقام پر جب کوئی جاننے والا مل جاتا ہے، تو خواہ مخواہ اس سے بولنے چالنے کو طبیعت چاہتی ہے، شمشاد اپنی بیچ سے خود ہی اُٹھ کر، ماسٹر کے پاس پہنچا، ماسٹر بیچ کے سہارے نیچے لگا کر، سگریٹ پی رہا تھا، شمشاد نے اچانک پھونچ کر، ماسٹر کی آنکھیں پیچھے سے بند کر لیں،

۱۳۴
یہ کیا بیہودہ مذاق ہے، جی تم ہو کون؟ — ماسٹر گھبرا کر بولا۔

ہم سب کچھ ہیں، اس سے آپ کو کیا — اور — !
شمتا کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ ماسٹر نے جھٹکا دیکر، شمتا کے ہاتھ
آنکھوں سے ہٹا دئے، شمتا نے خوب زور کا قہقہہ لگایا، اور ماسٹر شمتا کی
صورت دیکھ کر، سہم گیا۔

بھئی! ماسٹر کہاں جانیکی تیاری ہے — شمتا دینچ پر بیٹھتے
ہوئے بولا۔

تیاری کہیں جانے کی نہیں ہے، میرے بھائی
طوفان ایکسپریس سے آرہے ہیں، اُن کے لینے کے لئے
آیا ہوں — ماسٹر نے گھبرا کر جواب دیا۔

تو آپ اکیلے ہی آئے ہیں، یا کوئی ساتھ بھی ہے۔ شمتا نے دریا کیا۔
ساتھ کون ہوتا۔ اکیلا ہی ہوں، آپ کو نظر
نہیں آتا، کیا آپ کو میرے پاس کوئی بیٹھا ہوا دکھائی

دیتا ہے — ماسٹر ادھر ادھر
دیکھتے ہوئے بولا۔

ارے! ماسٹر صاحب! آپ ذرا سی بات کا
برّا مان گئے، میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے ساتھ کوئی
دوسرا آدمی نہیں ہے، مگر میں نے آپ کو زنا نہ ویٹنگ
روم میں کسی عورت سے کئی بار بات کرتے ہوئے دیکھا

ہے، اسی لئے میں نے آپ سے یہ بات دریافت کی کہ

کوئی اور ساتھ تو نہیں ہے ————— شمشاد نے جواب دیا

شمشاد کا یہ سوال سن کر، ماسٹر ایک دم خاموش ہو گیا، اُس کا چہرہ
فق پر گیا، اور اُس کی آنکھوں سے چوری ٹپکنے لگی،

جی ہاں! میری بہن میرے ساتھ ہیں — ماسٹر بہت ہی دبی
اور جھجکی ہوئی آواز سے

ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ میں تنہا ہوں، میرے
ساتھ کوئی نہیں ہے ————— شمشاد نے پیرلاتے
ہوئے کہا۔

میں سمجھا کہ آپ یہہ پوچھ رہے ہیں کہ کوئی مزد
تو آپ کے ساتھ نہیں ہے ————— ماسٹر نے جواب دیا۔
آپ کی بہن، اور زنانہ وٹینگ روم میں، آپ نے
تو ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ ہمارے یہاں پردہ نہیں ہے،
عورتیں آزادی کیساتھ باہر آتی جاتی ہیں ————— شمشاد نے فبت کیا

جی ہاں! میں نے جو کچھ کہا تھا، ٹھیک کہا تھا،
مگر میری یہہ بہن پردہ کرتی ہیں — اور ہاں! شمشاد
صاحب آپ کو تو قیصر پور جانا ہے، قیصر پور کی گاڑی آدھی
گھنٹہ میں چھوٹ جائیگی، ٹکٹ خرید لیجئے، ایسا نہو کہ گاڑی
چھوٹ جائے، اور آپ یہیں باتیں کرتے رہ جائیں۔ ماسٹر نے گفتگو کا مضو

بدلتے ہوئے کہا۔

ماسٹر اتنی بات کہہ کر، پیشاب کے بہانے چلا گیا، ماسٹر کی گھبراہٹی ہوئی باتوں پر جیمز فقروں اور متوحش انداز سے شمشاد کو حیرت ہوئی کہ یہہ اچھا خاصا آدمی آج ہی باتیں کر رہا ہے۔

شریفہ کا باپ ضلعدار، قیصر پور جانے کے لئے تانگہ میں بیٹھ کر اسٹیشن آیا، اور اتفاق کی بات کہ اُس کا تانگہ مسافر خانہ کی سڑک پر اُسی جگہ رکا، جہاں سے بہت قریب شمشاد بیٹھا ہوا، ضلعدار نے شمشاد کو دور سے پہچان لیا، وہ تانگہ سے اترتے ہوئے بولا۔

شمشاد صاحب! بھائی بڑی عمر ہے آپ کی، آج صبح ہی ایک صاحب سے بڑی دیر تک آپ کا ذکر رہا۔ ہاں! تو قیصر پور چل رہے ہیں آپ۔ کیا کٹ لیدیا۔۔۔ بھئی! آپ کیساتھ راستہ خوب ٹھیک۔

شمشاد نے اس کے جواب میں کہا:-

ہاں! میں مکان ہی چل رہا ہوں، ٹکٹ میں نے ابھی نہیں لیا، ایسی جلدی کیا ہے، طوفان ایکسپریس کے آکر چلے نیچے بعد کہیں ہماری گاڑی چھوٹے گی۔

آپ کے ماسٹر محمود سے اتفاق یہاں ملاقات ہوگئی کسی ضرورت سے ادھر گئے ہیں، اُن ہی کے انتظار میں بیٹھا ہوا

ہوں

شریفہ کا باپ ضلعدار، شمشاد کے پاس پہنچ کر بیٹھ گیا، اور اتنے میں ماسٹر

بھی آگیا، ضلعدار کو دیکھتے ہی ماسٹر کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا، اُس کے قدم ہلکے ہوئے پڑنے لگے، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے بجلی کے زور سے، اُس کی رُوح کھینچ لی گئی ہے۔

ماسٹر صاحب! آپ یہاں کیسے —! ضلعدار نے ہنسی بیک کو چھوتے ہوئے کہا

میں اپنے بھائی کے ”رُستبوا“ کرنے کے لئے آیا ہوں، وہ اس گاڑی سے آرہے ہیں — ماسٹر نے جواب دیا۔
قیصر پور سے آپ کب آئے — ضلعدار نے دریافت

کیا۔
قیصر پور سے آئے ہوئے تو کئی دن ہو۔ ماسٹر گھبرا کر بولا۔
میرے پاس تو کل ہی ملازم، شریفہ کی ولدہ کا خط لیکر آیا ہے، اُس میں لکھا تھا کہ ماسٹر صاحب یہاں موجود ہیں، ابھی دو ایک دن اور رہیں گے، آپ فرماتے ہیں کہ قیصر پور سے آئے کئی دن ہو گئے۔ ضلعدار نے کہا۔
حیرت ہے کہ بیگم صاحبہ نے ایسی بات کس طرح

لکھ دی۔

ماسٹر نے بات ختم کی، اور زمانہ وٹینگ روم کی ملازمہ نے آکر، ماسٹر سے کہا کہ بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں۔
مجھے بلا رہی ہیں، بیگم صاحبہ! — ماسٹر نے انگلیاں

چٹختے ہوئے جواب دیا

جی ہاں! آپ ہی کو بھاری ہیں، وہی نیلے
برقعہ والی، جو آپ کیساتھ آئی ہیں، اُن کو کچھ تکلیف
معلوم ہوتی ہے، ابھی ابھی چپکے چپکے رو رہی تھیں

چلیے، جلدی چلیے! ————— ملازمہ نے کہا۔

ماسٹر کے لئے یہہ انتہائی نازک اور کشمکش کا موقع تھا، وہ تھوڑی دیر
چپ کھڑا رہا، یہاں تک کہ اُس نے اپنے پر اگندہ حواس جمع کر لئے، ضلعدار
اور شمشاد، اس کا مُنہ تک رہے تھے، اور دونوں طرف سکوت طاری تھا

بیکم صاحبہ سے کہتے ہیں ابھی آنا ہوں، میرے
روپیوں کا بٹوا، بگ اسٹال پر رہ گیا ہے، ریل کے
ٹکٹ بھی تو اُسی میں تھے۔

ماسٹر نے، وٹینگ روم کی ملازمہ کو مخاطب کرتے ہوئے یہہ جملے کہے
اور اس تیزی کیساتھ اسٹیشن کی طرف دوڑا، جیسے سچ مچ کوئی چیز جھول آیا ہو
ماسٹر بڑی پھرتی کیساتھ جنکشن کے پلیٹ فارم پر پھونچا، پلیٹ فارم پر پھونچ کر اُس
نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ لیکن شمشاد اور ضلعدار
کو اُس کا پیچھا کرنے کی کیا ضرورت تھی، وہ تو حقیقت سے بالکل بے خبر تھے، ماسٹر
نے مال گودام کے دروازے سے باہر سڑک پر آ کر، شہر کے لئے تانگہ کیا، اور چلتا

سنا۔

وٹینگ روم کی ملازمہ نے ماسٹر کی کہی ہوئی بات، شریفہ سے جا کر

لوٹ دئی، شریفہ کو ماسٹر کی بات سے قدرے پریشانی ہوئی، اور اُس نے وٹینگ روم کے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا، شریفہ کا باپ ضلعدار وٹینگ روم کے دروازے کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، ایک دوسرے کو دونوں نے دیکھا، شریفہ باپ کو دیکھ کر، اندر ہو گئی، ضلعدار کو شریفہ کے وٹینگ روم میں ہونے کا وہم بھی نہ ہو سکتا تھا، مگر اُس نے اپنی آنکھ سے شریفہ کو دیکھا تھا، اس لئے وہ عجیب کشمکش میں گرفتار ہو گیا۔

قیصر پور کے لئے ٹرین چھوٹنے میں بہت ہی کم دیر رہ گئی تھی، شمشاد نے اُٹھتے ہوئے کہا، کہ ضلعدار صاحب! چلیے ٹکٹ لے لیں، گاڑی چھوڑی ہی والی ہے، ضلعدار اس کے جواب میں بولا:-

بہت اچھی بات ہے، ضرور ٹکٹ لے لیجئے، مگر ہاں! وہ شریفہ نہیں تھی، دُنیا میں انسانوں کے چہرے ملتے جلتے بھی تو ہوتے ہیں۔

ضلعدار کے اس بے جوڑ جواب پر، شمشاد نے کہا:-
 شریفہ۔! واہ! شریفہ کا یہاں کیا ذکر ہے، ضلعدار صاحب! یہ آپ کیا خواب دیکھ رہے ہیں، صاف صاف کہیئے، آپ کس خیال میں ہیں، اور کیا کہنا چاہتے ہیں۔

ضلعدار نے اس کے جواب میں کہا کہ میں نے ابھی ابھی زنانہ وٹینگ روم میں ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔ اس کا چہرہ، بالکل میری لڑکی شریفہ سے ملتا جلتا ہے، ناک، نقشہ، آنکھیں، قد، بالکل شریفہ جیسا۔!

ما سٹریے جو شمشاد سے گفتگو کی تھی کہ میرے ساتھ کوئی نہیں ہے، میں بالکل
 تنہا ہوں، اُس کے بعد کہا کہ میری بہن میرے ساتھ ہے، پھر شمشاد کے جرح کرنے پر
 بولا کہ میری یہ بہن پردہ نہیں کھاتی، یہ تمام باتیں ضلعدار کے فقر و کھیت
 مل کر ایک پراسرار داستان بن گئی، شمشاد نے زمانہ و ٹینگ روم کی
 ملازمہ کو اشارے سے بلا کر، اُس سے پوچھا، کہ وٹینگ روم میں اس وقت
 کتنی عورتیں ہیں، ملازمہ نے جواب دیا کہ اب تو کل تین عورتیں رہ گئی ہیں،
 ایک بچہ کی ٹرین سے بہت سی عورتیں چلی گئیں۔

جن بیگم صاحبہ نے اُن صاحب کو بلایا تھا،
 جو اپنے رویوں کا بٹوالینے کے لئے دوڑے ہوئے
 گئے ہیں، کیا اُن سے تمھاری کچھ بات چیت ہوئی؟ شمشاد نے ملازمہ
 سے پوچھا۔

جی ہاں! میں نے اُن سے باتوں باتوں میں،
 پوچھا تھا کہ آپ کہاں سے آرہی ہیں، تو اُس کے جواب
 میں انہوں نے کہا کہ میں قیصر پور سے آرہی ہوں،
 پھر فوراً ہی گھبرا کر بولیں، ارے! میں نے غلط کہا،
 میں تو مغل سرائے سے آرہی ہوں، — ملازمہ نے جواب دیا۔
 شریفہ کا باپ ضلعدار، حیرت اور بے چینی کیساتھ شمشاد اور ملازمہ کی
 باتیں سن رہا تھا، ملازمہ کے جواب سے شمشاد کو بڑی حد تک یقین ہو گیا کہ ہونہ ہو
 یہہ ماسٹر کی فتنہ پردازی ہے، اور ”وہ لڑکی جسے ضلعدار نے دیکھا ہے، یقیناً

شریفہ ہے۔ اس شبہ کے یقین سے بدل جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ماسٹر اسٹیشن جا کر واپس نہیں ہوا۔ شمشاد نے دو تین منٹ تامل کیا، اور پھر ملازمہ سے بولا کہ اُسی رٹکی سے جس کا تم نے ابھی ذکر کیا ہے، جا کر کہو کہ تمہارے والد ضلعدار صاحب تم کو بلارہے ہیں، ملازمہ نے ویننگ روم کے اندر جا کر کہا۔

بیگم صاحبہ! آپ کے والد ضلعدار صاحب آپ کو

باہر بلارہے ہیں۔

شریفہ نے ملازمہ کی بات سن کر گردن نیچے جھکالی اور چپکے چپکے رونام شروع کیا۔ جب ملازمہ چلی گئی تو ضلعدار نے، شمشاد کو ٹھوکا دیکر کہا۔

بھائی شمشاد! آپ بھی عجیب آدمی ہیں، ایک غیر عورت کے پاس بے دھڑک پیام بھیج دیا کہ تمہارے باپ تم کو بلارہے ہیں، مجھے تو آپ کی متانت اور سنجیدگی سے ایسی اُمید نہ تھی، کہیں مذاق مذاق میں کوئی آفت نہ آجائے۔

شمشاد اس کے جواب میں بولا۔

ضلعدار صاحب! یہ بھیدا بھی کھلا جاتا ہے۔ کہ میں مذاق کر رہا ہوں، یا میری سنجیدگی جاسوسی کے زبردست فرائض انجام دے رہی ہے۔ گھبرائیے نہیں، تماشائی کی طرح پردے کے اٹھنے کا انتظار فرمائیے۔

ملازمہ نے شریفہ سے بہت کچھ کہا کہ آپ میری بات کا کچھ جواب دیجئے، مگر وہ برابر روتی رہی، جب ملازمہ کو بہت دیر ہو گئی، تو شمشاد نے ویننگ روم کے دروازے

پر جا کر تالی بجائی، ملازمہ تالی کی آواز سن کر باہر آئی، اور کہا کہ آپ کی بات میں نے بیگم صاحبہ سے کہہ دی، وہ سوجھ بکائے ہوئے رو رہی ہیں، جواب نہیں دیتیں۔

اچھا! تمہارے ویٹنگ روم میں، ان بیگم صاحبہ کے علاوہ، جو دو عورتیں ہیں، ان سے کہہ دو، کہ دو منٹ

کے لئے ذرا پردے میں ہو جائیں۔ شمشاد نے ملازمہ سے کہا

بہت اچھا! میں ان سے ابھی جا کر کہتی ہوں۔ ملازمہ نے جواب دیا۔
شمشاد نے ضلعدار کو اشارے سے بلایا، ضلعدار دوڑا ہوا آیا، اور گھبرا کر پوچھا۔
بھئی شمشاد! یہ کیا کر رہے ہو؟
شمشاد نے جواب دیا:-

جو کچھ میں کر رہا ہوں، وہ آپ کو ابھی معلوم ہو جائے گا۔

گھبراہ بیٹے نہیں۔
اتنے میں ملازمہ نے آکر کہا کہ دونوں عورتیں پردے میں ہو گئیں۔ اور وہ بیگم صاحبہ بدستور رو رہی ہیں۔

ضلعدار صاحب! آپ ویٹنگ روم میں بے دھڑک چلے جائیے، آپ کو وہاں آپ کی لڑکی شریفہ بیگم۔ شمشاد نے کہا۔
میری لڑکی شریفہ، اور ویٹنگ روم میں عجیب کس قسم کی باتیں ہیں آپ کی، شمشاد صاحب! کیا آپ مجھے پھنسوانا چاہتے ہیں، بھائی! اسی مہینہ کی بات ہے کہ ہمارے ہی ہندکے محکمہ تار بابو کو ایک عورت کے ذرا

چھڑ دینے پر دو مہینہ کی سزا ہو چکی ہے، مجھ بوڑھے آدمی کو
آپ قربانی کا بکرا کیوں بنانا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ ضلعدار نے جواب دیا۔

میں آپ کو نہ تو قربانی کا بکرا بنانا چاہتا ہوں، اور
نہ آپ کے خلاف کوئی سازش کرنا مقصود ہے، میں جو کچھ
کہہ رہا ہوں، اُس پر عمل کیجئے، جائیے، اندر جائیے، آپ
کس سمجھ کے آدمی ہیں، کہ اتنی کچے باتیں سننے اور دیکھنے
کے بعد بھی، آپ کچھ نہیں سمجھ سکے، تعجب ہے۔ ا آدمی
کو اتنا غائب دماغ اور سیدھا بھی نہ ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ شمشاد نے جواب دیا۔

اچھا! میں ویٹنگ روم کے اندر جانے کو تیار ہوں
مگر صاحب! میری شریفہ! یہاں کس طرح آسکتی ہے، یہ
بات تو واقعی میری سمجھ میں نہیں آتی۔۔۔۔۔ ضلعدار چھڑی اوپر کو
اٹھاتے ہوئے بولا۔

یہ بات کہ شریفہ یہاں کس طرح آئی، شریفہ کی ہی
زبانی آپ کو معلوم ہوگی دیکھئے، زیادہ حجت نہ کیجئے،
خدا کے لئے! اندر جائیے، زیادہ تاخیر مناسب نہیں۔۔۔۔۔ شمشاد نے قدرے
تیزی کیساتھ کہا۔

ضلعدار، شمشاد کے کہنے سے ویٹنگ روم کی طرف بڑھا، پہلے وہ دروازے
پر کئی بار کھانسا، اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک عورت نیلے رنگ کے
برقعہ میں لپٹی ہوئی چپکے چپکے رو رہی ہے، بات کرنے کی اسکی ہمت نہ پڑتی تھی، وہ دل

ہی دل میں کہنے لگا:۔

شریفہ کے برقعہ کا رنگ بھی نیلا ہے، اور ہاں! اس عورت کا پمپ شو، ارے۔! میں شریفہ کے لئے غمائش سے بالکل سی میل کا جو تاخیر کر لیا تھا۔ یہہ معصہ کیا ہے۔ (شریفہ کی چند انگلیاں کھلی ہوئی تھیں) اور ہاں! اس کی انگلیاں، شریفہ کی انگلیوں سے ملتی جلتی ہیں، اور انگوٹھی بھی بالکل وہی ہے۔

ضلعدار کو پوری محبت کے جوش نے بے تاب کر دیا، اس نے اپنے تصورات پر جرح و تعدیل کے بغیر شریفہ کے شانے کو ہلا کر، بھرائی ہوئی آواز میں کہا:۔

شریفہ! تم یہاں کیسے۔!

شریفہ، باپ کی انگلیوں کے لمس کو محسوس کرتے ہی، باپ سے لپٹ کر رونے لگی۔ ضلعدار کا بھی دل بھر آیا، اور اُسکی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ ٹینگ روم کی ملازمہ یہہ دیکھ کر باہر آئی اور شمشاد سے جا کر کہا کہ وہ گیمنا اور جن صاحب کو آپ نے بھیجا ہے، دونوں کے دونوں رو رہے ہیں، آپ کسی طرح ان صاحب کو باہر بلائیے، صبح کے وقت میم صاحبہ معاینہ کرنے کے لئے آتی ہیں، زنا نہ میں مرد کو دیکھیں گی، تو مجھے نہ جانے کیا کیا کہیں گی۔

شمشاد نے ملازمہ کے ہاتھ میں چوٹی پکڑتے ہوئے کہا کہ تم گھبراؤ نہیں، میں ابھی دونوں کو باہر بلاتا ہوں۔ شمشاد نے دروازے سے جھانکا، تو شریفہ، ضلعدار سے لپٹی ہوئی سسکیاں لے رہی تھی، اور ضلعدار، بھیگے ہوئی پلکوں کو ہتھیلیوں سے پونچھ رہا تھا۔

شمشاد نے دروازے کے قریب جا کر کہا کہ ضلعدار صاحب! شریفہ کو لیکر باہر آجائیے، ایک سپر س آ رہا ہے، دوسری زنانی سواریاں آگئیں، تو آپ دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر کیا کہیں گی، ضلعدار نے، شریفہ کو بہت کچھ تسلی دی، اور کہا کہ اب روناد ہونا ٹھیک نہیں ہے، مردانہ مسافر خانہ میں مذاق بن جائے گا، شریفہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، اور دونوں ویٹنگ روم سے باہر آگئے۔ قیصر پور جانے والی گاڑی چھوٹ چکی تھی، اور گاڑی نہ بھی چھوٹتی تو بھی ضلعدار اس واقعہ کے بعد قیصر پور جانے کے لئے تیار نہ تھا۔

افواہیں

ضلعدار نے، سرے کے لئے تانگہ چکایا، اور تینوں تانگہ میں بیٹھ کر روٹ ہوئے اور ذرا سی دیر میں، سرے پہنچ گئے۔ سرے میں پھونچ کر، ضلعدار نے شمشاد کے پیر کھڑے کر عزت، آبرو آپ کے ہاتھ ہے، اس بھید کو جہاں تک ہو سکے چھپانے کی کوشش کیجئے، اور ہاں! میں تو اب قیصر پور میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا، میں اب وہاں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔ میں دو ایک دن میں صاحب سے مل کر دو مہینہ کی رخصت لیلوں گا، اُس کے بعد قیصر پور کے علاقہ سے کسی اور علاقہ میں تبادلہ کی کوشش کروں گا، شریفہ کی ماں، شریفہ کے یکا یک غائب ہو جانے کی وجہ سے بہت پریشان ہونگی، اور قصبہ میں نہ جانے لوگ کیا کیا بہتان باندھ رہے ہونگے، آپ خدا کے لئے اتنا کیجئے کہ میرا خط قیصر پور لیکر چلے

جائیے، یا کسی اپنے رازدار اور خاص آدمی کے ہاتھ بھجوا دیجئے، شمشاد نے ضلعدار کو بہت کچھ کہا سنا، مگر آپ پر مغرب زدگی، اور زمانہ کی تہذیب اور فیشن کے تصور چھائے ہوئے تھے، آپ نے دیکھ لیا کہ میں نے جو کچھ کہا تھا کہ وہ کس قدر درست نکلا، لیکن اب میں اس داستان کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا، آپ خود اپنی غلطی پر دل میں پشیمان ہو رہے ہوں گے، اور میں سمجھتا ہوں، اور سمجھتا کیا ہوں، بلکہ اس بات پر میرا ایمان ہے کہ ندامت اور پشیمانی سے غلطی کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ندامت، حقیقت میں ایک طرح کی توبہ ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ توبہ کے بعد، پچھلی غلطیوں اور کوتاہیوں کو دہرانا کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں آپ کا خط لیکر خود قیصر پور جاتا ہوں، اور دو چار دن کے بعد پھر واپس آتا ہوں، جب تک آپ کی موجودہ حالت میں بھی کمی ہو جائیگی، اور اس وقت آپ کسی بات کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکیں گے۔

ضلعدار نے بیوی کے نام خط لکھ کر، شمشاد کو دیا کہ کمال خاں کو لیکر فوراً یہاں چلی آؤ، سامان بعد میں منگالیا جائے گا، اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، شریف میرے پاس موجود ہے۔ شمشاد نے ضلعدار کے یہاں خط پہنچا دیا، اور ضلعدار کی بیوی، کمال خاں کیساتھ دوسرے صبح کو قیصر پور سے روانہ ہو گئی۔ قیصر پور میں شریف کی یکایک گم شدگی کے متعلق عجیب عجیب روایتیں مشہور تھیں، یہی موضوع ہر زبان پر چڑھا ہوا تھا، اور اس خبر نے قیصر پور میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ مردوں کی صحبتوں میں اس واقعہ کو عجیب عجیب پیرایہ میں بیان کیا جاتا تھا :-

انگریزی پڑھی ہوئی عورت کہیں پردے میں بیٹھ سکتی ہے، کوئی شخص اُسے ضرور بھگا لے گیا، اور صاحب! یہ کہنا بھی غلط ہے، ایسی آزاد عورتیں تو مردوں کو خود بھگا لی جاتی ہیں، بھلا مرد ان کے بھگانے کی کیا ہمت کر سکتا ہے —

ایک کرشناں جیسا شخص، ضلع دار کی بیٹی کو سنا ہے کہ گانا سیکھانے کے لئے آتا تھا، جوان آدمی کیساتھ، جو ان عورت کی تنہائی! کیا خبر ہے کہ کسی راز کو چھپانے کے لئے ضلع دار کی لڑکی نے خود کشی کر لی ہو، یہ آج کل کی لکھی پڑھی عورتیں تو جان کو مہتیلی پر لئے پھرتی ہیں، جہاں کوئی خلاف مرضی بات ظہور میں آئی، جھٹ سے خود کشی کر لی۔ اسی ہفتہ کے اخبار میں ہم نے پڑھا ہے کہ ممبئی میں ایک پارسی لڑکی، کسی بات پر والدین سے ناراض ہو کر سمندر میں گر کر ہلاک ہو گئی۔

اس لڑکی کو میں نے ایک دفعہ دیکھا تھا، تھی تو بڑی خوبصورت تھی کہ اس کا رشتہ جہاں ہونے والا تھا، اُس رشتہ سے وہ ناراض تھی، کیا عجب ہے کہ اُسی غصہ میں وہ گھر سے نکل بھاگی ہو۔ مگر اس کو ماں باپ کی عزت کا تو کچھ لحاظ کرنا چاہیئے تھا۔ تم دیکھ لینا، باہر جا کر اس لڑکی کی مٹی پلید ہو جائے گی، جب تک جوانی ہے، اس وقت تک لوگ خوب اُو بھگت کریں گے اُس کے بعد تم اُس کو کسی چکلے میں بیٹھا ہوا دیکھنا —

سنا ہے کہ چین اور برما کے کچھ لوگ فقیروں کے بھیس میں پھرتے ہیں، اور لڑکوں، لڑکیوں کو بہکا کر اور زبردستی پکڑ کر لیجاتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ کسی ایسے ہی فقیر کے ہاتھ یہ لڑکی پڑ گئی ہو، قیصر پور کی عورتوں کی باتیں، مردوں سے زیادہ مزیدار تھیں :-

خالہ جان! سنا، ضلع دار کی لڑکی شریفہ بھاگ گئی، ضرور بھاگ گئی ہوگی، اگر وہ نہ بھاگتی تو مجھے تعجب ہوتا۔ اُس لڑکی کے رنگ ڈھنگ ہی کچھ ایسے تھے، ایک دفعہ میں اُسکے یہاں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ہونٹوں پر کوئی لیدار لال چیز لگا ہے، آئینہ سامنے رکھا ہے، اور خوب بن سنور رہی ہے، میں نے اُسکی ماں سے پوچھا کہ آج کیا کہیں جانے کا ارادہ ہے، اس کی ماں نے جواب دیا کہ میں تو آج کہیں جانے کا ارادہ نہیں رکھتی، اتنے میں شریفہ بن سنور کمر لگائی، قمیص پر واسکوٹ تو اُس نے ایسی چست پہنی تھی، کہ سینہ کے بٹن ٹوٹے جا رہے تھے، اور اُس کے بدن پر خواہ مخواہ نگاہ پڑتی تھی۔ ہونٹ بالکل لال بھبھوکا بنے ہوئے تھے، میں نے اُس سے پوچھا کہ تم نے ہونٹوں پر جو مرہم لگا رکھا ہے، تو کیا تمہارے ہونٹوں میں کوئی تکلیف ہے، میرے اس کپڑے پر شریفہ اور اُسکی ماں دونوں نے اس زور سے قہقہہ لگایا کہ میں تو کھسیانی ہو گئی۔ میں نے ہنسنے کا سبب پوچھا تو بولی کہ یہ مرہم نہیں ہے، سُرخ ہونٹ بھلے لگتے ہیں، اسی لہو

۱۴۹
ہونٹوں پر یہہ چیز لگائی گئی ہے۔

اور ہاں سکیبنہ بہن! میں اپنے چھوٹے بھائی سراج کا، ضلع دار کے یہاں پیغام لیکر گئی تو شریفہ کی ماں نے کہا کہ ہم گاؤں، یا قصبہ میں اپنی بیٹی کو دیکر اس کی قسمت ہرگز نہ چھوڑیں گے، ہماری شریفہ کو تو کوئی انگریزی پڑھا لکھا تبر نمبر چاہیے۔ میرے اللہ نے اچھا ہی کیا، جو اس لڑکی کا رشتہ میرے بھائی کے ساتھ نہ ہوا، میرا بھائی تو ابا کے سر کی قسم، اپنا اور اس کا خون کر ڈالتا۔

بی بی۔! میں نے شریفہ کی ماں کو کئی مرتبہ ٹوکا کہ بیٹی بیٹی کا گھر میں رکھنا، اچھا نہیں، مگر اسکی ماں نے بگڑ کر جواب دیا کہ میری بیٹی ہے، میں جب چاہوں گی، بیاہوں گی، آپ پراسکا کونسا بوجھ ہے، جو اس کے اتارنے کی ایسی فکر چڑھی ہوئی ہے، اجی! بھابی! ہم بھی تو آخر ایک دن جوان تھے، اور تم نے تو میری جوانی دیکھی ہے، خدا لگتی کہنا، میری ہمجولیوں میں میرے پلے کا کوئی تھا۔ میں اللہ آمین سے چار بچوں کی ماں ہوں، مگر اب بھی اس زمانہ کی جوان لڑکیوں سے کم نہیں ہوں، تو ہاں! اپنی جوانی میں ہم ابا جان کی غیر موجودگی میں کبھی کبھار ایک آدہ گیت گنگنا لیا کرتے تھے، ایک دن میں گیت خوب زور زور سے گارہی تھی، ابا جان نہ جانے کہاں سے آگئے

اور انھوں نے آکر جو میری مرمت شروع کی ہے، تو چھٹی کا دودھ
 یاد دلادیا۔ ہماری تو گھٹی میں غیرت ملا کر پلائی جاتی تھی، مگر یہ
 شریفہ تو ایک غیر مرد سے گانا سیکھتی تھی، ہونہ ہو یہہ اُسی مرد
 کی کاروائی ہے، شریف لڑکیاں کہیں گانا سیکھا کرتی ہیں،
 بڑی ماں! میں نے اُسکی کتابوں میں عورتوں، مردوں کی
 ایسی بڑی تصویریں دیکھی تھیں۔ کہ ان کا ذکر کرتے ہوئے مجھے
 تو شرم آتی ہے۔ اور یہ شریفہ اس طرح ٹھٹھا مار کر ہنستی تھی،
 جیسے یہہ کئی بچوں کی ماں ہے، کنواری لڑکیوں کی تو شرم حیا
 تو مشہور ہے۔

تم تو سب میری باتوں پر ہنسا کرتی ہو، میں یقین سے
 کہنتی ہوں کہ ضلع دار کی لڑکی کو کوئی جن اڑا کر لینگیا، میں نے
 اُس کی ماں کو ایک دفعہ نوکا بھی تھا کہ جو ان چچی کو عطر، پھول کیا
 کوٹھے پر نہ بھیجا کرو، مگر اُس بڑھیا نے میرا کہا نہ مانا، یہہ جن
 بڑے عاشق مزاج ہوتے ہیں، شام کو جب دونوں وقت
 مٹے ہیں، بستیوں اور آبادیوں میں پھرا کرتے ہیں، جہاں کوئی
 اچھی صورت نظر آگئی، بس اُسے لے اڑے۔ وہ سب کو دیکھتو
 ہیں، اُن کو کوئی نہیں دیکھ سکتا، اب اسکی ایک ہی شکل ہے، کہ
 سیدوں کے محلہ کی مسجد کے ملاجی سے مل رہا ہو یا جلے، جن آپ ہی
 لڑکی کو اُس کے گھر بھونچا جائے گا۔

خانہ آبادی

شمشاد کے قیصر پور واپس آنے پر لوگوں نے اُس سے تازہ واقعہ کا تذکرہ کیا، شمشاد نے کہا کہ تم لوگ بلاوجہ کیوں فکر میں پڑے ہوئے ہو، لڑکی اپنے باپ کے پاس ہے، میں خود اسے دیکھ کر آیا ہوں، افواہوں کو طرح طرح کے حاشیے چڑھا کر پھیلا نا مناسب نہیں۔ شمشاد کی اس اطلاع نے کہ لڑکی اپنے باپ کے پاس ہو، لوگوں کے منہ بند کر دیے، اور افواہوں کا چڑھنا ہوا سیلاب، آن کی آن میں اُتر گیا، تین چار دن کے بعد شمشاد عظیم گنج بھونچا ضلعدار نے دو ہفتہ کے لئے عظیم گنج میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا اور وہ رخصت کے لئے کوشش کر رہا تھا۔

شمشاد سے جب ضلعدار کی ملاقات ہوئی تو ضلعدار نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا، اور پوچھا کہ قیصر پور میں لوگ میرے متعلق کیا کہتے ہیں، شمشاد نے کہا کہ میرے پہونچنے سے پہلے تو لوگ جو دل میں آیا، کہتے تھے، مگر میں نے جا کر جب کہا کہ لڑکی تو اپنے باپ کے پاس ہے، میں خود اس کو دیکھ کر آیا ہوں تو اس کو بعد وہ لوگ مطمئن ہو گئے، بلکہ اپنی قیاس رائیوں پر پشیمان ہونے لگے۔ ضلعدار نے کہا کہ میں تو شریفہ اور اسکی ماں کو وطن میں چھوڑ کر حج کو چلا جاؤں گا، مجھے تو لوگوں کو منہ دکھاتے ہوئے شرم آتی ہے، خدا ایسا کرے کہ مجھے اُسی پاک زمین میں موت آجائے شمشاد نے ضلعدار کو تسلی دیتے ہوئے جواب دیا کہ زیارت حج سے میں آپ کو

نہیں روکتا، ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑی اور سعادت کیا ہو سکتی ہے، لیکن آپ جو ان بیٹی کو گھر میں چھوڑ کر حج کا ارادہ نہ کیجئے، آپ کے پیچھے نہ جانے کیا بات پیدا ہو جائے، ضلعدار نے کہا کہ ایسی خبریں دور دور پھیل جاتی ہیں، اب میری بیٹی کا رشتہ ہونا مشکل ہے، اسکی شکمش اور الجھن سے گھر اگر تو میں حج کا قصد کر رہا ہوں شمشا لے ضلعدار کو تسلی دیتے ہوئے جواب دیا کہ آپ بالکل مطمئن رہئے، اس کا بندوبست میں انشاء اللہ کر دوں گا۔ اس واقعہ کے بعد شریفہ کا بیاہ ضرور کر دینا چاہیئے، اور آپ کی بیگم صاحبہ کو شریفہ کیساتھ، اس قسم کا برباد کر نیکی ضرورت ہی جو اس کے دل سے، اس واقعہ کے اثر کو بڑی حد تک دور کر دے۔

عظیم گنج میں شمشاد کا دوست افضل کپڑے کی تجارت کرتا تھا، افضل نے بہت ہی تھوڑے سرمایہ سے اس بیوپار کو شروع کیا تھا، مگر اس کی دیانت داری اور محنت کی بدولت، چند ہی دن میں کام کہیں سے کہیں پہنچ گیا، وہ راست دسائرس مال منگاتا تھا، اور شہر میں اسکی بات نبی ہوئی تھی۔ افضل نے شمشاد سے کتنے ہی ستر اپنی شادی کے متعلق ذکر کیا، اور شمشاد نے وعدہ بھی کر لیا کہ وہ اس سلسلہ میں ضرور کوشش کریگا، شمشاد کو اپنے قصبہ کی اصلاحی پروگرام نے فرصت نہیں دی، اس لئے افضل کے بار بار یاد دلانے پر بھی، وہ کچھ نہ کر سکا۔

شمشاد اپنے دوست افضل کے خیالات سے پوری طرح واقف تھا، وہ شمشاد کی نسبت کو ذہن میں لیکر، افضل کے گھر پہنچا، افضل دیوانخانہ میں بیٹھا ہوا، اخبار پڑھ رہا تھا۔

السلام علیکم! سیٹھ افضل بھائی! ملک التجار۔ شمشاد نے زور دار

لہجہ میں کہا۔

علیکم السلام! ارے کون! شمشاد ہو، آؤ آؤ
بھٹی! کدھر راستہ بھول پڑے۔ _____
افضل نے گردن پھیر کر
جواب دیا۔

تو یہ آپ پہلے سے پیش بندی فرما رہے ہیں
کہ کہیں میں شکوہ نہ کرنے لگوں، اور آپ کو پشیمان نہ ہونا پڑے۔ شمشاد نے بیٹھتے
ہوئے کہا۔

میری پشیمانی کی بھی ایک ہی رہی! قوم و ملک کے
مصلحین کو تو ایسی سیاسی قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ افضل، اخبار کو
تہہ کرتے ہوئے بولا۔

بڑے دن کی تعطیلوں میں تم شکر گڑھ کے تالاب
شکر کھیلنے گئے تھے، میں نے سنا ہے کہ تم وہاں تین دن
ٹہرے رہے، قیصر پور وہاں سے کچھ دور تھوڑی تھا، اگر ذرا
غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمادیتے تو کیا بگڑ جاتا۔ مگر ہاں!
آپ تو اب بڑے آدمی ہو گئے ہیں، چھوٹے آدمیوں کی کب
پروا کرتے ہیں۔ _____ شمشاد نے جواب دیا۔

بھٹی شمشاد! تمہارا شکوہ بالکل درست، اور
تمہاری خفگی سرائے آنکھوں پر! میں اپنے قصور کا اقرار کرتا
ہوں، مگر تمہیں نہیں معلوم کہ میں کن مشکلات میں پھنسا

ہوا تھا، ہماری جنگی کے سکتیر کے لٹکے میرے ساتھ تھے، اُن
کم بختوں سے میں نے بہت کچھ کہا کہ میں اپنے دوست
قیصر پور جا کر مل آؤں، مگر وہ راضی نہیں ہوئے، ساتھیوں
کو ناراض کر کے جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ مگر میں وعدہ کرتا
ہوں کہ ابھی آؤں، فصل میں کئی دن کے لئے قیصر پور آؤں گا، بھائی
تمہارے یہاں کی ماش کی دال، آم کا آچار اور کھیر یاد
آتی ہے، تو زبان چٹخا رہے بھرنے لگتی ہے۔ — افضل نے شمشاد
کا ہاتھ تھام کر کہا۔

افضل نے نوکر کو آواز دیکر بلایا کہ پان لیکر آؤ، اور گھر میں کہو
کہ رات کا کھانا ہم بھائی شمشاد کیساتھ کھائیں گے، اور ہاں — !
دیکھو، شمشاد میاں کو سیخ کے کباب بہت پسند ہیں، تم کھانیکے وقت
کلونان بائی کے قریب کی دوکان سے گرم گرم کباب ضرور لانا۔
کہیے! اصلاحی پروگرام کی مصروفیت میں کوئی وقت
تم نے ہمارے لئے بھی نکالا، یار! عجیب بنفیکرے آدمی ہو۔ افضل نے اگلا دن
اٹھاتے ہوئے بولا۔

کس کام کے لئے کہہ رہے ہو تم۔! میں تو کچھ نہیں
سمجھا، بعض تم بدر چاچ کی زبان میں باتیں کرتے ہو۔ شمشاد نے جواب دیا۔
اللہ غنی۔! اس سادگی پہ کون نہ مر جائے
اے خدا۔! یعنی بالکل انجان بن کر باتیں کر رہے ہو اُس

یہاں! میں اپنی شادی کے متعلق کئی دفعہ تم سے ذکر کر چکا ہوں،
 تمہارے تعلقات بہت لوگوں سے ہیں، اور تمہارے انتخاب
 پر بھی مجھے حد سے زیادہ اعتماد ہے، لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ
 سامنے تو سر ملا جاتے ہو کہ ضرور خیال رکھوں گا، اور پھر جو
 غائب ہوتے ہو، تو دو پیسہ کا کارڈ بھی بھیجنے کی توفیق نہیں
 ہوتی۔ _____ افضل نے کہا۔

ہاں! تو یہ کہنے کہ جوانی گدگدی کر رہی ہے، شادی
 شادی! میاں اس حالت میں بڑے مزے میں ہو، کوئی
 کالے سر کی پلے بندہ گئی، تو اٹے دال کا بھلو معلوم ہو جائیگا
 قسم خدا کی سٹار کھیلنے کے لئے ترس جاؤ گے، اب تو تم بالکل
 آزاد ہو، جہاں چاہا، چلے گئے، جو چاہا کھالیا، پہن لیا۔ شمشاد نے مسکراتے
 ہوئے جواب دیا۔

شمشاد! میں تمہاری طرح قوم کا لیڈر تو ہوں نہیں
 کہ دن رات، لوگوں کو نصیحت کرنے کرتے اور سمجھاتے
 سمجھاتے اپنے کو تباہ کر لوں، اور دنیا کا کوئی خیال ہی نہ
 آئے، آزادی اچھی چیز ہے، مگر دنیا میں سب لوگ شادی
 بیاہ کرتے ہیں، اور یہہہ رسم تو باوا آدم کے زمانہ سے
 چلی آرہی ہے، اور سچ تو یہہہ ہے کہ عورت کے بغیر مرد کی
 زندگی ادھوری رہتی ہے، مجھے دیکھو! دن بھر دوکان

شمشاد نے صبح کا ناشتہ افضل کے یہاں کیا، اور اُس کے بعد سیدہ ضلعدار کے پاس پھونچا، اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد شریفہ کی شادی کا ذکر نکالا، شمشاد نے نہایت تفصیل کیا تھ بات چیت کی، ضلعدار افضل سے تھوڑا بہت واقف تھا، ضلعدار کی بیوی تو فوراً ہی راضی ہو گئی، ضلعدار بھی قریب قریب راضی تھا شمشاد نے اس پر کہا کہ یہ رشتہ بڑا نازک ہے، آپ لوگ اچھی طرح نشیب و فراز سوچ لیں، اور ہاں! شریفہ سے رائے لینے کی بہت زیادہ ضرورت ہے، کیوں کہ میں اور آپ تو سب کے سب رسمی تقریب کے بعد علیحدہ ہو جائیں گے، اُس غریب کی تو ساری زندگی کا سودا ہے۔ آپ شریفہ کی رائے معلوم کیجئے، اور خود بھی سوچئے، میں شام کو خود افضل کو یہاں بلا کر لاؤں گا، شریفہ کو ایک نظر افضل کو ضرور دیکھ لینا چاہیئے، ازدواجی زندگی میں سیرت اور کردار کو بہت کچھ دخل حاصل ہے، مگر ”صورت“ کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، ضلعدار نے کہا کہ آپ کی رائے سے مجھے پورا اتفاق ہے، شام کو آپ اور افضل میرے یہاں چائے پیجئے۔ شمشاد، دوپہر کے وقت افضل کی دوکان پر پہونچا، اور بولا کہ چلیے! نوشہ صاحبہ، سسرال سے بلاد آیا ہے، خوب بن سنور لیجئے، میں نے آپ کے حسن کی بہت تعریف بہت کر دی ہے، ایسا نہ ہو کہ مجھے چار شریف آدمیوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے افضل نے ہنستے ہوئے، شمشاد کا دامن پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا کہ تمہیں لوگوں کو خوب بے وقوف بنانا آتا ہے۔

شام کو افضل اور شمشاد دونوں ضلعدار کے یہاں پہونچے چائے نوشی ہوئی ادھر ادھر کے تذکرے لگے، شریفہ اور اُسکی ماں نے جھروکے سے افضل کو دیکھا

اور یہ صحبت ختم ہو گئی، شمشاد اپنے دوست افضل کو اُس کے گھر بھجی کر، ضلعدار کے یہاں واپس آیا، ضلعدار نے کہا کہ میں اور شریف کی ماں تو پہلے ہی سے راضی تھے شریف سے دریافت کیا گیا تو اُس نے بھی رضامندی کا اظہار کر دیا، شمشاد نے کہا تو پھر بسم اللہ! نیک کام میں ہمیشہ جلدی کرنی چاہیے، ضلعدار نے جواب دیا کہ مجھے آپ کی رائے سے پورا اتفاق ہے مگر اتنی جلدی مناسب نہیں ہے، مجھے کم سے کم ایک ہفتہ کا وقت تو ملنا چاہیے اس عرصہ میں تھوڑا بہت سامان کر لوں گا، اور قریب کے عزیزوں کو اطلاع بھی دیدی جائے گی۔

افضل نے تو شادی کے معاملہ میں شمشاد کو پورا اختیار دے دیا تھا، اُس نے ایک ہفتہ میں مختصر ساز یور اور دلہن کے لئے جوڑے تیار کرائے، اور انتہائی سادگی کیساتھ شادی کی تقریب پائیہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ شریف دلہن بن کر، سُسرال میں پہنچی، سُسرال والوں نے، حسین و جمیل دلہن کا بڑی گرم جوشی کیساتھ استقبال کیا، شریفہ میں بڑی دلکشی پائی جاتی تھی، دلہن بن کر تو وہ ستر با قدم مقناطیس بن گئی کہ آدمی دیکھتے ہی، اُس کی طرف خود بخود کھینچتا تھا، خوبصورتی بھی عجیب چیز ہے، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بد صورت دلہن کے مقابلہ میں خوبصورت دلہن کو سُسرال کے بچے تک آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، اور خوبصورتی کیساتھ سیرت بھی اگر نیک ہو، تو پھر ایسی دلہن، سُسرال میں ملکہ بن کر رہتی ہے، شریفہ میں دونوں خوبیاں موجود تھیں شادی کے کچھ دن بعد، شمشاد سے ملاقات ہوئی تو افضل نے شمشاد کا بہت شکریہ ادا کیا، اور اپنی شادی کے متعلق بڑی پر لطف اور اطمینان بخش باتیں کیں، شمشاد کو بھی بیحد خوشی ہوئی کہ میاں، بیوی دونوں خوش ہیں۔

افضل نے شریفیہ کا نام بدل دیا وہ اُسے ”نادرہ“ کہہ کر پکارتا تھا، شریفیہ کو بھی یہ نام پسند تھا، افضل اور نادرہ سچ سچ ایک دوسرے کے شریک حیات تھے

سکازشیں

ماسٹر محمود جو شریفیہ کو موسیقی کی تعلیم دیا کرتا تھا، اس واقعہ کے بعد عظیم گنج سے فرار ہو گیا، اُس کے دل میں چورتھا، اس لئے ہر سپاہی کو دیکھ کر وہ سمجھتا تھا کہ وہ اُسے پکڑنے کے لئے آرہا ہے، اُس کو یقین تھا کہ شریفیہ کے باپ نے انتقام لینے کے لئے اُس کے خلاف ضرور کارروائی کی ہوگی، وہ کچھ دنوں تک چور کی طرح ادھر ادھر بھاگتا رہا، پھر تاربا، عظیم گنج کے جس اسکول میں وہ ملازم تھا، وہاں کے ایک مدرس نے، جس سے ماسٹر نے قرضہ لیا تھا، یہہ دیکھ کر کہ وہ کئی مہینہ سے غائب ہے، اور اسکول میں نہ تو رخصت کی کوئی درخواست بھیجی، اور نہ کسی کو کوئی اطلاع دی، ماسٹر کے خلاف خیانت مجرمانہ کی کارروائی کر کے، اُس کے نام گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا، اور پولس نے اُس کا تعاقب شروع کر دیا، دو ایک جگہ تو ماسٹر اپنی چالاکي سے، پولس کے ہاتھ میں نہ آکر نکل گیا مگر اب پولس اُس کا تیزی کیساتھ پیچھا کر رہی تھی۔ اُس کو دو ڈر لگے ہوئے تھے۔ ایک تو اسی خیانت مجرمانہ کے استغاثہ کا ڈر تھا، اور سب سے بڑا خوف ضلع دار کا تھا، ماسٹر چند دن تو ادھر ادھر چھپا پھرا، آخر کار لوگوں کی زبانی سُننے میں آیا کہ وہ نیپال کی طرف چلا گیا، اور اُس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

شمتشاد نے قیصر پور کی فضا کو بہت کچھ ہموار کر لیا تھا، اور اُس کے پروگرام کا

بڑا حصہ پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ شمشاد میں قریب قریب وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک مصلح اور ریفارمر میں ہونی چاہئیں، بے نفسی، لوگوں کے دکھ درد کا صحیح احساس، ضبط نفس، تحمل، رواداری، عملی قوت اور شاید سے نبرد آزما ہونے کی ہمت، یہ تمام خوبیاں اس میں پائی جاتی تھیں، اُس کی اسکیم کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کی گئیں، مگر اُس نے تمام مزاحمتوں کا دلیری اور استقلال کیساتھ مقابلہ کیا، دُنیا نے ہمیشہ اس قسم کے نیک لوگوں کیساتھ انتہائی سنگدلی کا برتاؤ کیا، اور پھول برسانے والوں کے راستوں میں سدا کاٹنے پچھائے ہیں، اور قند و نیا کا شربت پلانے والوں کے لئے، زہر کے پیالے تیار کئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ مسخ فطرتیں اور مکر وہ خبیث ذہنیتیں، اصلاح اور نیکی کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتیں، وہ کسی خرابی کے درست ہو جانے اور بُرائی کو اچھائی سے بدل جانے میں اپنی شکست اور نقصان محسوس کرتی ہیں، اُس لئے وہ ہر اصلاح اور بھلائی کے خلاف قدم اٹھاتی ہیں، اور اس مخالفت کے جوش میں وہ ہر خوفناک سے خوفناک گناہ اور شرمناک سے شرمناک جرم کا ارتکاب کر سکتی ہیں۔ دُنیا کی تاریخ کے بہت سے ابواب ان ہی سیاہ کاریوں کی داستانوں سے سیاہ ہیں۔

شمشاد کے بھی قیصر پور میں بہت سے مخالف پیدا ہو گئے، یہہ لوگ، قصبہ ابوالہ کو شمشاد کی طرف سے بدظن کرنے کے لئے طرح طرح کی باتیں مشہور کرتے تھے، سب سے پہلے اُس کی دیانت پر حملہ کیا گیا، اور لوگوں میں یہہ خبر پھیلائی گئی کہ شمشاد نے پبلک کا بہت سا روپیہ اپنے نام سے بینک میں جمع کر دیا ہے، شمشاد کے کانوں تک بھی یہہ خبر پہنچی، اور اُس نے پبلک فنڈ کا حساب ایک مشترکہ کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا،

کمبلی کے ارکان کو یہ سہریچہ کرجیرت ہوئی کہ شمشاد نے کسی اعلان اور شہرت، و نمود کے جذبے کے بغیر، اپنا ذاتی روپیہ سبک کاموں میں صرف کیا ہے۔ ہرے لوگ شکست کھا کر، اور زیادہ شقیان اور مکر وہ باطن ہو جاتے ہیں، شمشاد پر وہ جواز لازم لگاتے تھے، اُسکی تردید کے بعد اُن کا سازشی جذبہ اور زیادہ تیز ہو جاتا تھا۔

شمشاد نے اپنے گھر میں قصبہ کی بچیوں کے لئے ایک اسکول قائم کر دیا تھا، شمشاد کی بڑی بہن کے ہاتھ میں اس اسکول کا انتظام تھا۔ شمشاد کے مخالفین نے لوگوں میں مشہور کر دیا کہ شمشاد اسکول کی بچیوں کو چھپ چھپ کر دیکھا کرتا ہے، اور اس زمانہ مدرسہ کے پردے میں وہ کوئی اور مقصد رکھتا ہے، شمشاد کو جب اس افواہ کا علم ہوا تو اُس نے ایک مکان، کسی دوسرے محلہ میں کرایہ پر لیا، اور اسکول کو وہاں منتقل کر دیا۔ جب مخالفین کا یہ نہ نشاۃ بھی چوک گیا تو ایک مسجد کے ملا سے سازش کر کے کہیں سے ایک فتویٰ منگوا دیا کہ مسلمان لڑکیوں کو لکھانا پڑھانا ناجائز ہے، بس زیادہ سے زیادہ قرآن شریف پڑھا دینا چاہیے، اس سے زیادہ کچھ پڑھنا حرام ہے، اس فتنہ کو شمشاد نے جیسے تیسے دبایا، مستند اور مشہور علما سے فتوے حاصل کئے اور بہت سی تقریریں کیں۔ شمشاد کی تقریروں کا لوگوں پر بہت اثر ہوا۔ شمشاد آتش بیان مقرر نہ تھا، لیکن چونکہ ہر بات دل سے نکلتی تھی، اس لئے اُس کے بے ترتیب جملے بھی شریلوں کا کام کرتے تھے، کہ ادھر زبان سے بات نکلی، اور دل میں اُترتی چلی گئی۔

شمشاد بہت خاموشی کیساتھ کام کر رہا تھا، اور اُس کا پروگرام، صیافتی پریکٹس سے بے نیاز تھا، مگر خاموش بھولوں کی خوشبو کی طرح، اُس کے کام کی شہرت بھی قرب وجوار میں پھیل گئی، اور پڑھے لکھے لوگ اُس سے ملنے کے لئے آئے لگے۔ ایک مرتبہ ایک عالم اُس سے ملنے کے لئے آئے، اور کئی دن رہ کر واپس چلے گئے، اس اتنی سی بات

مخالفین نے حاشیے چڑھائے کہ یہ عالم چشمشاد کے پاس آیا تھا، سلطان ابن سعود کا سیخٹ تھا، سلطان نے کوئی بھاری رقم تو بابیت کی تبلیغ کے لئے، شمشاد کے پاس بھیجی ہے، جب ہی تو یہ شمشاد نئی نئی باتیں نکالتا ہے کہ قبروں کو سجدہ کرنا شرک ہے، مزاروں پر چادریں چڑھانا بدعت ہے، قوالی سُنانا درست نہیں، یہ وہابی ایسی ہی باتیں تو کرتے ہیں، ان کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ بزرگوں کا نام و نشان مٹ جائے، جو چیز بھی مانگو، یہہ کلکا لوٹا روپیہ کے لالچ میں آکر، ایسی بے دینی کی باتیں کرتا ہے، ہمارے بڑے بڑے تو اس سے زیادہ عقلمند اور اللہ رسول کی باتوں سے واقف تھے شمشاد نے اس افواہ کی بھی تردید کی اور جہاں تک اُس کا مقدور تھا، اس شبہ کو رفع کر دیا کہ سلطان ابن سعود نے اُس کے پاس کسی ایجنٹ کو نہیں بھیجا، اور جن خیالات کی وہ تبلیغ کرتا ہے، وہی عین اسلام۔ مخالفین کے جب تمام حربے بیکار گئے، تو انھوں نے اب سرکاری عہدیداروں سے ساز باز شروع کی، یہہ اُن کا آخری اور کامیاب ترین حربہ تھا۔ سرکاری حکام کو شمشاد کا اصلاحی پروگرام ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، اس پروگرام کی بدولت انکا جابرانہ اقتدار ختم ہو گیا تھا، اور اُنکی ”خدائی“ نزع کے آغوش میں آخری سسکیاں لے رہی تھی، جن لوگوں کے ہاتھوں میں انتظامی قوت ہوتی ہے۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ رعایا کا سر نیاز، ہر دم اُن کے آستانے پر جھکا رہے، لیکن قیصر پور کی تو دنیا ہی بدل چکی تھی، سب لوگ ایک دوسرے کیساتھ ہمدردی کرتے تھے، آپس میں جھگڑے بہت ہی کم ہوتے تھے، اور وہ بھی قومی پنچایت میں طے ہو جاتے تھے، حکام قیصر پور میں آتے ہوئے گھبراتے تھے، وہاں نہ تو کوئی سُٹھی گرم کرنے والا ملتا تھا، اور نہ اُس ”جابرانہ حکومت“ کا مزہ آتا تھا، جو ایک خاک نشین کو کم سے کم ”خداوند نعمت“ اور ”ان داتا“ بنا دیتی ہے۔

عہدیدار اس اصلاحی اسکیم کی کھل کر مخالفت بھی نہ کر سکتے تھے، کیوں کہ اُس کا کوئی جرح حکومت کے قانون اساسی سے نہیں ٹکراتا تھا چونکہ لوگوں میں یکساں تھا، اس لئے کسی مخالفت کا ردوائی کے لئے تائید بھی حاصل نہ ہو سکتی تھی۔

اب قیصر پور میں چند بد معاش لوگ پیدا ہو گئے تھے، اور انکی سازشی فطرت کے بھروسہ پر سرکاری عہدیدار اس اصلاحی نظام کے درہم برہم کر نیکلے لئے پُر پُزے رکھنے لگے۔ یہ منافقین، عہدیداروں کے ہر دم کان بھرتے رہتے تھے، کبھی تحصیل سے کہہ دیا کہ آج شمشاد کہہ رہا تھا کہ تحصیلدار صاحب کی ساری حکومت خاک میں ملا دوں گا، کبھی تھانیدار کو ورغلا دیا کہ شمشاد آپ کے خلاف درخواستیں بھجوانیکی کوشش کر رہا ہے۔ عہدیدار کان کے کچے ہوتے ہیں، وہ لوگوں کی کہی ہوئی باتوں کی تحقیقات نہیں کرتے جس نے جو بھی کہا، سُن لیا، اور اُن کے دل میں اُسی وقت سے گرہ پڑ گئی۔ شمشاد سے حکام بہت زیادہ ناراض تھے، لیکن اُس کی ہمہ گیر قبولیت کے باعث اُس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ گرمی کا زمانہ تھا، شمشاد کی آنکھیں دُکھنے لگیں، اور اس تکلیف نے یہاں تک طول کھینچی کہ اُسے ضلع کے ہسپتال میں جانا پڑا۔ شمشاد کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قیصر پور کے وہ لوگ، اگرچہ بی حیثیت کے آدمی تھے، مگر شمشاد کا ہر کام میں ہاتھ بٹاتے تھے، کئی مقدمات میں مانخوذ کر اڑے گئے۔ شمشاد کی آنکھیں ابھی پورے طور پر اچھی نہ ہوئی تھیں، لیکن اس خبر کو سنکر وہ ڈاکٹروں کی ہدایت کے خلاف قیصر پور چلا آیا۔ بہت سے لوگ مختلف الزامات میں پھنسے ہوئے تھے، اور ضلع میں اکثر مقدمات کی نوعیت پیچیدہ اور خطرناک ہو گئی تھی، اس لئے شمشاد کو عظیم گنج میں رہ کر پیروی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، او

۱۶۴
اور وہ عظیم گنج چلا آیا۔ شمشاد سمجھتا تھا کہ چند دن میں تمام معاملات سلجھ جائیں گے، مگر اسکی توقع غلط ثابت ہوئی، اور اُسے بہت دنوں کے لئے عظیم گنج میں رک جانا پڑا۔ اس مصروفیت نے اُس کے اصلاحی پروگرام کو یقیناً نقصان پہونچایا، اُسی کی تنہا ذات، اُس اسکیم کی رُوح تھی، اور اب اس رُوح کو، اپنا جسد کو چھوڑ کر، عظیم گنج میں آ جانا پڑا۔

بجوری !

عظیم گنج میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک سوداگر نے مسافر خانہ تعمیر کرا دیا تھا، جس کے ایک حصہ کو لوگ ”ہٹل“ کہتے تھے۔ عظیم گنج کے لئے، یہ رہنمائی و اُتاری ہوئی کی حیثیت رکھتی تھی۔ شمشاد کو مقامات کے سلسلہ میں، عظیم گنج میں مسلسل رہنا پڑتا تھا، اُس نے مسافر خانہ کا ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ چند دن کے بعد افضل سے شمشاد کی ملاقات ہوئی، اور جب افضل کو یہ معلوم ہوا کہ شمشاد نے مسافر خانہ میں کمرہ کرایہ پر لیا ہے، تو اُس نے بہت زیادہ خفگی کا اظہار کیا، اُس نے کہا کہ کیا بھائی شمشاد! میں ابھی مرا نہیں ہوں، زندہ ہوں، جب میں مرجاؤں تو پھر سرائے یا ہٹل میں ٹہرنا یا کسی اور کے یہاں، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے جیتے جی، تم میرے گھر کو چھوڑ کر، اور کہیں قیام کرو، شمشاد نے جواب دیا کہ میں اپنے قصور کی معافی چاہتا ہوں، مگر میں اُٹل! مہمانداری، دو چار دن اور زیادہ سے زیادہ ہفتہ دو ہفتہ کی ہوتی ہے، مجھے تو مقامات کے سلسلہ میں کئی مہینہ پہاں ٹہرنا پڑیگا، تم خود ہی انصاف کر کے بتاؤ کہ اتنے دن تک کی مہمانداری کہاں تک مناسب ہے، افضل نے کہا، اجی حضرت! آپ کو مہمان کون مردود سمجھتا ہے، آپ کا گھر ہے، مہینہ

دو مہینہ سال، دو سال جب تک جی چاہے رہیے، آپ کے لئے کوئی اہتمام تھوڑی کیا جائے گا، اور ہاں آپ اسی وقت مسافر خانے میرے ساتھ چلیے، میں خود آپ کا استا وہاں سے لیکر آؤں گا، افضل اور شمشاد دونوں مسافر خانے چھوٹے اور تھوڑی دیر میں اسباب لیکر واپس ہو گئے، اور شمشاد افضل کے گھر میں مقیم ہو گیا۔

افضل کے باپ کی آمد کی تو کچھ ایسی زیادہ نہ تھی، مگر انھوں نے مکان بہت سلیقہ سے تعمیر کرایا تھا، بات یہ تھی کہ افضل کے باپ کے یہاں اینٹوں کا بھٹہ تھا، جتنی اینٹیں فروخت ہونے سے بچ رہتی تھیں، اُن کو مکان میں لگا دیا کرتے تھے اس طرح چند سال میں تھوڑا تھوڑا اضافہ ہوتے ہوتے، اچھا خاصہ مکان بن گیا زمانہ میں دوہرے، تہیرے والاں تھے، کشادہ کمرے اور لانا چوڑا صحن، اُمرانہ حصہ، زمانہ حصہ سے بالکل ملحق تھا، صدر دروازہ بند کرنے پر، مردانہ حصہ بھی، زمانہ حصہ میں شامل ہو جاتا تھا۔

افضل کے مکان کے مردانہ حصہ کی، ایک دیوار، راستہ پر تھی، اور اسی دیوار کے کمرے میں، شمشاد کا اسباب رکھا ہوا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، سب لوگ صبح میں سو رہے تھے، پوروں نے اسی کمرے میں نقب لگایا، اور شمشاد کے ٹرنک سے نقدی اور کاغذات نکال کر لے گئے۔ صبح کو شمشاد نے کمرے کو کھولا، تو دیوار میں بڑا سا سوراخ نظر آیا، اُس نے افضل کو آواز دی، افضل دوڑا ہوا آیا، شمشاد نے اپنے ٹرنک کو دیکھا تو اُس کا فضل ٹوٹا ہوا تھا، اور نقدی اور مقدمات کے کاغذات غائب تھے، شمشاد نے تھانہ میں جا کر رپورٹ لکھائی، اور پولس نے تفتیش شروع کر دی۔

قیصر پور میں جب یہ خبر پھونچی، تو بہت سے لوگ اظہار ہمدردی کے لئے، شمشاد کے پاس آئے، جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ مقامات کے کاغذات چوری گئے ہیں، تو سب کا خیال قیصر پور کی اُس بد معاش پارٹی کی طرف گیا، جو شمشاد کی مفت تھی۔ پولس نے اتنا تو پتہ لگایا تھا کہ قیصر پور کے فلاں فلاں لوگوں نے یہ سب کچھ کیا ہے، مگر یہ صرف ”تفتیش“ تھی، کوئی چیز ایسی برآمد نہیں ہوئی، جس کی بنا پر ملزموں کو پکڑا جاسکے، اور کوئی چیز برآمد بھی کہاں سے ہوتی، کاغذات کو تو اُن لوگوں نے جلا دیا تھا، اور پچاس سو روپیہ جو کچھ وہ لوگ چُر کر لے گئے تھے، وہ کھاپی کر برابر کر دے، اور اگر وہ روپیہ اُن کے پاس ہوتا بھی، تو روپیوں پر شمشاد نے اپنی مہر تھوڑی لگا دی تھی۔ بُرائی کو کتنا ہی چھپاؤ، ظاہر ہو کر رہتی ہے، شمشاد کے مخالفین نے جب دیکھا کہ پولس تفتیش کے باوجود، ان کو نہ پکڑ سکی، تو انھوں نے اپنی خاص محنتوں میں، اس کامیابی کو فخریہ بیان کرنا شروع کیا۔ قیصر پور کے لوگوں کو یہ بات بہت بُری معلوم ہوئی، انھوں نے پولس والوں سے جاکر کہا کہ ہمارا شبہ فلاں فلاں کو پر ہے، پولس نے کہا کہ تم میں سے اگر دو چار شخص گواہی دینے کے لئے تیار ہو جائیں تو ہم ابھی ملزمین کو گرفتار کئے لیتے ہیں، ان لوگوں نے کہا کہ جتنے گواہوں کی ضرورت ہو مل سکتے ہیں۔ پولس کو جب اطمینان ہو گیا تو اُس نے تین آدمیوں کو گرفتار کر کے اُن کا چالا کر دیا۔

مقدمہ شروع ہوا، پولس نے شمشاد سے کہا کہ تمہارا جن لوگوں پر شبہ ہے اُن کے نام عدالت کے سامنے بیان کر دینا، اور ہاں! تم اتنا اور کہہ دینا کہ میں نے ایک شخص کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا، وہ اُن ہی ملزمین میں سے تھا۔ شمشاد نے جواب دیا

کہ میں قیامت تک جھوٹ نہیں جھول سکتا۔ نہ میرا کسی پر شبہ ہے اور نہ میں نے کسی کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ پولس انسپکٹر نے اس پر کہا کہ بھائی! آپ بڑے سید معلوم ہوتے ہیں، مقدمہ کو اسی طرح بنایا جاتا ہے، شمشاد صاحب! کسی کو جیل بھجوانا آسان نہیں ہے، بڑی ترکیبوں اور مصلحتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور یہ آپ کی جھوٹ کی بھی ایک ہی کہی بغیر جھوٹ کے تو اس دنیا میں کام ہی نہیں چلتا۔ اور مقدمات کی ترتیب میں تو تھوڑی بہت رنگ آمیزی کرنی ہی پڑتی ہے۔ میں ایک سچے مقدمہ ہی کو آپ کے سامنے مثال کے طور پیش کرتا ہوں، اُس سے آپ اندازہ لگالیں گے، کہ اس دنیا میں سچائی بھی رنگ آمیزی کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

شمشاد صاحب! جو کچھ میں کہ رہا ہوں، اُسے غور سے سنئے۔ سب انسپکٹر نے کہا میں بہت غور سے سن رہا ہوں، آپ فرماتے جائیے۔ شمشاد نے جواب دیا اس پر سب انسپکٹر بولا کہ دیکھئے ایک شخص کو چوراہہ پر، ایک شخص لاٹھی سے زخمی کر دیتا ہے، تین آدمیوں کو جنہوں نے اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، بطور گواہ کے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ گواہ قانون کی اصطلاح میں رویت کے گواہ یعنی شاہد کہے جاتے ہیں، انکی شہادت بہت وزن رکھتی ہے۔ ان گواہوں کو اگر پہلے سو کوئی معقول آدمی کچھ نہ بتا دے، تو یہ عدالت میں جا کر ایک ہی واقعہ کو قدرے اختلاف کیساتھ بیان کریں گے، اور جرح میں تو ضرور مختلف ہو جائیں گے۔ بات یہ ہے کسی ایک واقعہ کو جب دو آدمی بیان کریں گے تو الفاظ اور ترتیب بیان میں ضرور اختلاف ہوگا۔ عام طور پر ایسے واقعات آنا فانا ظہور میں آ جاتے ہیں، اور وہ بھی بالکل ناگہانی اور اچانک! دیکھنے والے واقعات کی جزئیات کو اُس ترتیب کیساتھ تو نہیں دیکھتے جسکی

مقدمہ کی ترتیب میں ضرورت پڑتی ہے۔ دیکھنے والوں نے یہہ تو دیکھا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو لاٹھی سے زخمی کر دیا۔ لیکن اس واقعہ کی ترتیب اُن کے ذہن میں قائم نہیں رہ سکتی، عدالت میں جب اُن کا بیان ہوگا، اور پھر اُس پر جرح ہوگی، تو اُن سے پوچھا جائے گا:—

مجروح، سڑک پر دوکان سے کتنے قدم کے فاصلہ پر کھڑا ہوا تھا۔

مجروح کے سر پر چوہلی ضرب لگی ہے، تو اُس نے سر کو سہلایا تھا یا کنبٹی کو—

اور ہاں دیکھو—: ملزم کی شیروانی کی جیب میں کوئی پنسل یا قلم بھی تھا۔

دوسری لاٹھی پر مجروح نے کہا تھا ”مجھے بچاؤ“ میں مر گیا

مجروح کے نگلی پر ایک دھبی بندھی ہوئی تھی، جس کا ایک حصہ لہو سے سُرخ تھا۔

اس واقعہ کے بعد جب چوراہہ پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے، تو اُن لوگوں میں سے کسی کے ہاتھ میں تینتروں کا پیچرا بھی تھا۔

اب آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ ایسے سوالات بالکل کیساں جواب دہ تین گواہ کس طرح دے سکتے ہیں، جنہوں نے اس واقعہ کو دیکھا ہے، دوکان اور سڑک کا فاصلہ بتانے میں کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور ہوگا، ذرا سی دیر میں یہہ واقعہ ظہور میں آگیا، اب

اتنی تفصیل اور ترتیب کس کے ذہن میں رہ سکتی ہے کہ ملزم کی شیروانی کی جیب کے پئسل کو بھی وہ دیکھ لے، اور مجرد کی انگلی کی بندھی ہوئی ڈبچی پر بھی اس کی نظر ہو۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ گواہ جاہل ہوتے ہیں عدالت کے کمرے میں پھونچ کر مرعوب اور خوفزدہ ہو جاتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ کسی واقعہ کی تفصیل آپ ہائیکورٹ کے ججوں سے دریافت کیجئے، تو ترتیب میں کچھ نہ کچھ لفظی اختلاف ضرور ہو جائے گا۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ میں ایک واقعہ کو جتنی بار بیان کیا جائے گا، ہر بار کچھ نہ کچھ کمی بیشی ضرور ہوگی۔

تو جب اجنب مولنا قبلہ صورت حال یہ ہے پھر آپ ذرا سی بات کہتے ہو کیوں بچکچاتے ہیں۔ میں یقین کیسا تھ کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے، وہ ہی حقیقی مجرم ہیں، شمشاد نے کہا کہ آپ جانیں، اور آپ کے مقدمہ کی ترتیب میں کسی طرح جھوٹ نہیں بھول سکتا۔ سب انسپکٹر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

پولس کی طرف سے جو قیصر پور کے چند آدمی، گواہوں کی حیثیت سے پیش ہو نیا لے تھے، ان سے بھی شمشاد نے کہہ دیا تھا، کہ جو کچھ تم کو معلوم ہو سچ سچ بیان کرنا میری ہمدردی میں اگر ایک لفظ بھی جھوٹ کہا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا، اور پہلی پیشی پر ہی ملزم بری کر دئے گئے۔ قیصر پور میں جب اس واقعہ کی خبر پہنچی، اور لوگوں کو اس مقدمہ میں شمشاد کا طرز عمل معلوم ہوا تو سب بے حد متاثر ہوئے، اور اسی ایک واقعہ نے قصبہ کی فضا کو بدل دیا۔ دشمنوں کے دل بھی پیسج گئے، اور مخالفین بھی تعریف کرنے لگے۔ کتنے ہی مقدمات، شمشاد کے مخالفین نے خود ہی اٹھائے۔ مگر چند بد معاش اب بھی شمشاد کے درپے آزار تھے، اور ان لوگوں کو جنہوں نے شمشاد کی مخالفت ترک کر دی تھی، طعنے دیتے تھے کہ تم

بڑے بزدل اور تھوڑے دل کے ہو، ان لوگوں کی مخالفت کے علاوہ دوتین مقدموں میں
خود سرکار مدعی تھی، اس لئے شمشاد کو عظیم گنج میں ٹہر جانا پڑا۔

انقلاب انگریزین!

اس واقعہ کے بعد شمشاد کا سامان، افضل کے مکان کے زنانہ حصہ کے ایک کمرے
میں، جو بہت محفوظ تھا منتقل کر دیا گیا۔ اور کوئی ایک مہینہ کے بعد افضل نے شمشاد
سے کہا کہ بھئی! اب اس اجنبیت اور مغائرت کو خیر باد کہہ دو، میں اپنے گھر کے لوگوں کو
تمہارے سامنے کئے دیتا ہوں یہہ پردہ آخر کب تک چلے گا؟ میں تم کو اپنے حقیقی بھائی
کی مثل سمجھتا ہوں، اور اب یہہ مغائرت برداشت نہیں ہو سکتی۔ شمشاد نے افضل
کی اس تجویز کی سختی کیساتھ مخالفت کی، مگر افضل اس تجویز کو پیش کرنے کے بعد اپنی بات
پراٹھ گیا، اور آخر کار ایک دن، افضل کے گھر کے لوگ شمشاد کے سامنے آگئے۔

افضل کے گھر میں تین عورتیں تھیں، افضل کی بیوی نادرہ، اس کی چھوٹی بہن بی بی
اور تیسری اس کی بیوہ بھوپھی۔ نور جہاں کی عمر سولہ سال کے قریب تھی، اور ماں باپ نے
اُسے بہت ناز و نعم سے پالا تھا۔ نور جہاں اور نادرہ دونوں بہنیں معلوم ہوتی تھیں، او
یہ عجیب اتفاق تھا کہ دونوں کے چہروں کا کٹ بہت زیادہ ملتا جلتا تھا، نادرہ کا رنگ
البتہ زیادہ کھلتا ہوا تھا، اور جسم بہت زیادہ گداز۔ نور جہاں کا رنگ گندمی تھا
جسم دبلا، پتلا، شوخ و طرار، بہت جلد بے تکلف ہو جانے والی، نور جہاں کے چہرے
پر بلا کی چھین تھی، اور مسکراتے وقت تو وہ سچ مچ کمنول کا پھول بن جاتی تھی، نور جہاں

۱۷۱
 سرتا بقدم لطافت و نزاکت تھی، اور لوگ اُس سے ایجا رمل کر، دوبارہ ملنے کی تمنا کرتے تھے۔

نورجہاں اس کمسنی میں انقلابات کی زندہ تاریخ تھی، وہ اُس کو غیر شعوری طور پر حوادث و انقلابات کی پُر خار وادیوں سے گزرنے پڑا تھا۔ نورجہاں کی عمر چار سال کے قریب تھی، کہ اس کے ماموں، اُسے اپنے گھر لے گئے۔ نورجہاں کے ماموں احمد حسین خاں گاؤں میں رہتے تھے، اور روئی کے بہت بڑے تاجر تھے۔ گاؤں کے قریب انھوں نے روئی کی گرنی قائم کی تھی، اُس پاس کے دیہات کی تمام کپاس، اس گرنی میں آتی تھی، احمد حسین خاں، اس علاقہ کے سب سے زیادہ مالدار تاجر تھے، اور اُن کی دولت کے قصے گاؤں والوں میں عجیب عجیب طریقہ سے مشہور تھے، کوئی کہتا تھا کہ جب ان کا مکان تعمیر ہو رہا تھا تو پُرانے مکان کی بنیاد میں، اشرفیوں سے بھری ہوئی دیگ مل گئی، کوئی کہتا تھا کہ ممبئی کے مسافر خانہ میں کوئی مسافر اپنا ہینڈ بیگ چھوڑ کر چلا گیا، احمد حسین خاں اُس ہینڈ بیگ کو اپنے تھیلے آئے، اب جو گھر آکر اُسے کھولا تو پورا ہینڈ بیگ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا، بس اُسی دن سے اُن کے دن پھر گئے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ ایک پھونچے ہوئے فقیر نے احمد حسین خاں کو ایک ایسا عمل بتا دیا تھا کہ صبح کو اُن کے تکیہ کے نیچے سو روپیہ رکھے ہوئے ملتے تھے۔ گاؤں کے لوگ تجارت کی ترقی کے راز سے واقف نہیں ہوتے، اُن بیچاروں کی دنیا تو چند بیگھے زمین اور دو چار بیل ہوتے ہیں، جب وہ کسی مالدار کو دیکھتے ہیں، یا انکے دیکھتے دیکھتے کوئی غریب آدمی، مالدار بن جاتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ اس کو کہیں غیب سے دولت مل گئی ہے۔

گرمیوں کا زمانہ تھا، نورجہاں کے ماموں احمد حسین خاں کی گرنی بند پڑی ہوئی تھی، گرنی کے چند مستقل ملازم گرنی کی صفائی میں مشغول تھے، گھاؤں سے ایک بہت بڑی بارات کسی دوسرے گھاؤں میں گئی ہوئی تھی، اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، احمد حسین خاں کے مکان پر رات میں ڈاکو چڑھ آئے۔ گھاؤں بھر میں احمد حسین خاں کے پاس ہی بند و قیں تھیں، ڈاکوؤں نے آتے ہی بند و قوں پر قبضہ کر لیا، احمد حسین خاں، نورجہاں کو بھی چاہتے تھے، اور اُسے اپنے پاس ہی سلاتی تھے، ڈاکوؤں کو دیکھ کر، احمد حسین خاں نے چلانا شروع کیا، اس پر ایک ڈاکو نے احمد پر گولی چلا دی، رائفل کی گولی، اور وہ بھی چند قدم کے فاصلہ سے چلائی گئی تھی، احمد حسین خاں گولی کھاتے ہی تڑپے اور نورجہاں کے ہلکے پھلکے بدن پر گر کر ختم ہو گئے، نورجہاں کی بساط ہی کیا تھی، دیڑھ من وزن کو کیا سنبھال سکتی تھی، وہ بھی اس صدمہ سے بیہوش ہو گئی، اور ڈاکوؤں کے جانے کے بعد، جب لوگوں نے اُسے لاش کے نیچے سے اٹھایا ہے، تو اس کے تمام کپڑے خون میں لت پت تھے، گاڈا میں یہ بات قصہ کے طور پر مشہور تھی کہ احمد حسین خاں نے بھانجی کو بچانے کے لئے اپنی جان دیدی۔

نورجہاں کوئی چھ سات سال کی تھی، کہ اس کو اپنی ماں کیساتھ، کسی گھاؤں میں جانا پڑا۔ کچرا راستہ تھا، ایک چھوٹی سی ندی کو پار کر کے اس گھاؤں میں جانا پڑتا تھا، گرمی کے دنوں میں عام طور پر ہندوستان کی ندیوں کا پانی کم ہو جاتا ہے، اور چھوٹی ندیوں سے تو لوگ ناؤ کے بغیر ہی گزر جاتے ہیں، نورجہاں اپنی ماں کیساتھ، جس گاڑی میں بیٹھی ہوئی۔ ندی کو پار

کر رہی تھی، بیچ ندی میں اُس گاڑی کا پہیہ ٹوٹ گیا، گاڑی کو زور سے دھکا لگا، اور نورجہاں اچھل کر پانی میں گر پڑی، نورجہاں کی ماں نے شور مچانا شروع کیا کہ میری بچی کو بچاؤ، گاڑی بان کو دکر، نورجہاں کو پانی سے نکال لاؤ، کئی ڈبجیاں کھا چکی تھی، اور اُس پر نیم بیہوشی طاری ہو چکی تھی،

نورجہاں کے ماموں جن کا ابھی ذکر ہو چکا ہے، نورجہاں سے بچہ محبت کرتے تھے، ایک مرتبہ وہ جنگل میں ہرن کا شکار کرنے کے لئے گئے اور نورجہاں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ چھوٹی چھوٹی خوبصورت گاڑیاں جن کو گاؤں والے ”ریلو“ کہتے ہیں، گاؤں والوں کے لئے موٹروں سے زیادہ کارآمد ہوتی ہیں۔ احمدین خاں کے ساتھ شکار میں دو ریلو تھے، ایک میں تو وہ، انکی نورجہاں اور اُن کے دو دوست بیٹھے ہوئے تھے، اور دوسرے ریلو میں ملازمین تھے، ملازمین کے ریلو میں دو اور احمدین خاں کے ریلو میں تین بند قیس تھیں۔ راستہ میں ہرن نظر آئے اور نورجہاں کے ماموں احمدین خاں نے فائر کر دیا ہرن بھاگ نکلے، ایک ہرن کچھ دور لنگر اتارنا ہوا بھاگا، اور جھاڑیوں میں گر پڑا، ملازمین دوڑے، اور ہرن کو ذبح کر کے اٹھا لائے، ہرن کو ملازمین نے اپنے تلنگے (ریلو کو تانگہ بھی کہتے ہیں) میں رکھ لیا، یہہ چور اور شکاری شگون لینے کے بہت عادی ہوتے ہیں، چوروں کے متعلق مشہور ہے کہ رات کو جب گھروں سے چوری کرنے کے لئے نکلتے ہیں، تو ایسے راستہ سے جانے کی کوشش کرتے ہیں، جہاں درخت بہت ہی کم ہوں، کیوں کہ اگر کسی رخت سے اُلو کی آواز ان کے کان میں آگئی، تو ان کا شگون بگڑ جاتا ہے، اور یہہ

۱۶۴
چوری کرنے کا ارادہ بدل دیتے ہیں، ایسے ہی شکاری بھی شگون پرست
ہوتے ہیں، جب یہہ شکار کے لئے جا رہے ہوں اور کوئی عورت اُن کے
سامنے سے خالی گھڑا لیکر نکل جائے تو یہہ بہت بُرا مانتے ہیں۔ گھر سے چلتے
وقت، یا راستہ میں کوئی شکاری ”چاقو“ یا ”چھری“ کا نام زبان سے نہیں لیتا،
جب ضرورت پڑتی ہے تو اشارے سے بتاتے ہیں، اگر کوئی انارٹی شکاری
چاقو اور چھری کہہ دے، تو اُس کے ساتھی بہت بُرا بھلا کہتے ہیں، اور سمجھتے
ہیں کہ آج شکار نہیں ملیگا۔ احمد حسین خان کے ملازم نے، گھاؤں سے تھوڑی
دور نکل کر کہا کہ سرکار! میں چاقو بھول آیا، چاقو لے آؤں، احمد حسین خان نے
نوکر کو بہت بُرا بھلا کہا، اور اپنے ساتھیوں سے بولے کہ خدا ہی ہے جو آج
شکار مل جائے!

ہرن کو تانگے میں رکھنے کے بعد دونوں تانگے روانہ ہو گئے، تھوڑی
دور جا کر نیل گائے نظر آئی، احمد حسین خان اپنے دوستوں کیساتھ بندوق لُٹو
ہوئے اترے، نورجہاں کے پاس ایک ملازم کو بٹھادیا، یہہ لوگ نیل گائے
کے تعاقب میں روانہ ہوئے، اور ایک چتیا قریب کی جھاڑی سے، ہرن کی بو
پا کر، تانگوں کے قریب آگیا۔ ملازم نے چیتے کو دیکھ کر شور مچایا، اور نورجہاں
بھی بے تحاشہ چیخنے لگی، اتنے میں احمد حسین خاں نے نیل گائے پر گولی چلا دی
چتیا گولی کی آواز سن کر گھبرایا، اور ملازم اور نورجہاں پر حملہ کرتا ہوا نکل گیا،
ملازم کا سر اور شانہ بُری طرح زخمی ہوا، نورجہاں جھکی ہوئی بیٹھی تھی چیتے
کا ناخن، اُسکی گردن سے چھو گیا، اور اسکی گردن سے لہو بہنے لگا۔

چینی کے ناخن کا نشان اسکی گردن پر اب تک موجود تھا، اور وہ اپنی سہیلیوں
 فر کیساتھ کہا کرتی تھی کہ میں نے بچپن میں شیروں اور چیتوں سے جنگ کی ہے
 نوجواں کی زندگی کے ان حالات نے اس میں جرات اور دیبا کی پیدا کر دی
 تھی، اور عام طور پر کنواری لڑکیاں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ڈر جاتی ہیں
 مگر نوجواں بہادر اور جری تھی!

اقدامِ محبت

ابتدا میں تو شمشاد، اپنے دوست افضل کے گھر والوں سے بڑے
 احتیاط اور شرم کیساتھ ملتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ معاشرت جاتی رہی، اور بے تکلفی
 ہو گئی۔ لیکن اس بے تکلفی سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ عورتوں کے جذبات کو کھیلنے
 کی کوشش کرتا تھا، صرف اتنا ہوا کہ وہ تھوڑی بہت دیر زمانہ میں بٹھ کر ادھر
 ادھر کی باتیں کرتا، اور پہلے کی طرح جھینپ کر شرما کر اور نیچی نظریں کر کے
 نہیں، بلکہ خوب کھل کر گفتگو میں حصہ لیتا۔

بھاج، ساس اور نند کی لڑائی، ہندوستان کی معاشرت میں
 اس طرح کھل مل گئی ہے کہ اسے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں کسی شوہر نے
 بیوی کی نازبرداری کی، یا کسی مسئلہ میں بیوی کی رائے سے اتفاق کیا، یا ہمدردی
 ظاہر کی، تو اس کی ماں اور بہنیں خفا ہو گئیں کہ لڑکا جو روکا غلام ہو گیا ہے
 ماں اور بہنوں کو کچھ نہیں سمجھتا۔ ماں اور بہنوں کی کسی بات میں تائید

کی جاتی ہے تو بیوی ناک بھوں چڑھانے لگتی ہے کہ مجھے باندی اور ماسمجھ رکھا ہے، میری کوئی بات نہیں چلتی۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں مل کر، ایک مستقل عداوت اور محنت بن جاتی ہیں۔ اور یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ مرد کو دو تیروں کا نشانہ بننا پڑتا ہے، اور جس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، دوسرے فریق اُس سے ناراض ہو جاتا ہے، تو ہوتا یہ ہے کہ آج بیوی ناراض ہے تو ماں اور بہنیں خوش ہیں، ماں اور بہنیں ناراض ہیں، تو بیوی کا چہرہ خوشی سے چمک رہا ہے۔ ہر گھر ان معاشرتی جنگوں کا میدان بنا ہوا ہے، اور بڑے بڑے عقلمند اس چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔

افضل کے یہاں تعلقات کی یہ کشیدگی نہیں پائی جاتی تھی۔ بات یہہ تھی کہ افضل کی بیوی نادرہ کو ساس سے واسطہ ہی نہیں پڑا، افضل کی بیوہ کچھ بھی خود ہی معذور تھی، اور زندگی کے دن کاٹ رہی تھی، نور جہاں کی انتہائی نیک دل اور شریف تھی، اُس نے بھابھ اور نند، بہن اور بھائی شوہر اور بیوی کے رشتوں کی اہمیت اور نزاکت پر کبھی غور ہی نہیں کیا پھر نادرہ کے طرز عمل نے اس کو بہت زیادہ گرویدہ بنالیا تھا، اور وہ چاہتی تھی کہ بھائی کی تمام ہمدردیاں نادرہ کے لئے ہی وقف ہو جائیں، جب کبھی کسی بات پر نادرہ اور افضل میں اختلاف ہوتا تو نور جہاں بھابھ کی تائید کرتی افضل کہا کرتا تھا کہ نادرہ نے نور جہاں پر جادو کر دیا ہے۔ افضل کا یہہ جملہ طنز آمیز تھا، مگر اُس نے جو کچھ کہا، سچ کہا، محبت اور خلوص جادو نہیں تو اور کیا ہے، اسی محبت اور پیار کے سلوک کی بدولت ہم نے شیریں

کے منہ میں لوگوں کو ہاتھ دیتے اور سانپوں کے پھنوں سے کھینٹا دیکھا ہے۔ افضل کی گھرلیو زندگی نہایت خوشگوار اور متنوع و فساد سے پاک تھی، وہ بہت مطمئن تھا، اور خوب مزے کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

شمشاد کو یوں تو افضل کے گھر کے تمام لوگ چاہتے تھے، مگر نور جہاں کو اُس سے خاص دلچسپی تھی، شمشاد کے کچری سے آلے کا شدت کیساتھ انتظار کرتی، اور اُس کے گھر سے جاتے وقت ایک خاص تاثر اُس کے چہرے پر پایا جاتا تھا۔ نور جہاں شمشاد کی ہر بات کا خیال رکھتی اور شمشاد کی ایسی اداس شناس ہو گئی تھی کہ شمشاد کے منہ سے بات نکلنے سے پہلے سمجھ جاتی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ شمشاد کو شامی کباب بہت پسند تھے، نور جہاں ہفتہ میں کئی بار شامی کباب تیار کرتی، اور ہاں، اماں تو برائے نام شامی کباب تیار کرتی تھی، کبابوں کی تیاری میں نور جہاں کا سارا دخل ہوتا تھا۔ اماں بہت سے بہت اتنا کرتی کہ سالہ بیس دیا، چولہے میں آگ سلگادی، نور جہاں گرمی کے مہینہ میں ٹھیک اُس وقت جبکہ چیل انڈا چھوڑتی ہے، خون پسینہ ایک کر کے شمشاد کے لئے کباب تیار کرتی۔ ایک دن وہ باورچی خانہ سے کباب بنا کر نکلی، خوب گرمی پڑ رہی تھی، شمشاد اُس دن کچری سے پیشی تبدیل کر کے بہت جلد اگیا، نور جہاں کے بال بکھرے ہوئے تھے، چہرہ آگ اور گرمی کے مارے متمایا ہوا تھا، دوپٹ سر سے ڈھلک کر شانوں پر آگیا تھا، انگلیاں گھٹی اور مسالہ میں سنی ہوئی تھیں۔

یہہ تمھاری حالت کیا ہو رہی ہے — شمشاد نے براہِ دے

سے آواز دی۔

آپ ہی کے لئے تو کباب بنا کر آئی ہوں، یہہ آپ کا

شامی کبابوں کا شوق، مجھے تباہ کر کے رہے گا۔۔۔ نور جہاں نے جواب دیا۔
تو آج سے شامی کبابوں کا بائیکاٹ!۔۔۔ شمشاد، انتہائی سنجیدگی
کیساتھ بولا۔

یہہ بائیکاٹ کی آپ کو بہت بے وقت سوچھی۔ نور جہاں نے ہنستے ہوئے کہا۔

تم نے ابھی ابھی تو کہا ہے کہ آپ کے شامی کیا ہوں
 کا شوق مجھے تباہ کر کے رہے گا تو میں تم کو اپنے شوق کے
 پیچھے تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ شمس الدین نے جواب دیا۔

میں نے تو مذاق سے کہہ دیا ہے، آپ نے سچ سمجھ لیا، شامی کباب تو مجھے خود بہت زیادہ پسند ہیں، جند دسترخوان پر کباب نہیں ہوتے، ایک دو چپاتی کم کھاتی ہوں۔ لیکن مجھے اپنی پسند پر مسرت ہے کہ اس معاملہ میں میری او آپ کی پسند متفق ہے۔

نورجہاں نے انگلیاں

ملنے ہوئے کہا۔

اتنے میں نادِرہ غسل خانہ سے نکل کر آئی، اور نور جہاں ہاتھ دھوئے لگی۔ کھانا کھانیکے بعد شمشاد اپنے کمرے میں چلا گیا، نور جہاں اور نادِرہ ایک کمرے میں لیٹ گئی۔ نادِرہ کی آنکھ بہت جلد لگ گئی، نور جہاں کمرے میں بدلتی رہی، اور آخر کار اٹھ کر بیٹھ گئی اور دل ہی دل میں کہنے لگی:-

میرا اس وقت جانا ان کو ناگوار ہوگا، وہ سو رہے ہوں گے

اور بھابی جان کی آنکھ کھل گئی، تو نہ جلے، وہ کیا خیال کریں گی۔
 مگر وہ مجھ سے ناخوش نہیں ہو سکتے، اور بھابی جان کیوں کچھ خیال
 کرنے لگیں، لاحول ولاقوۃ! بعض وقت میں کتنی بدگمان اور وہم
 بن جاتی ہوں۔

نور جہاں نے پلنگ سے اٹھ کر، تصویروں کا البم ہاتھ میں لیا، اور شمشاد کو
 کمرے میں پھونچ گئی، شمشاد مسہری پر خوب گہری نیند سو رہا تھا۔ نور جہاں نے جوتوں کو
 فرش پر رکھا، مگر شمشاد کو بیہوشی سی آواز کب جگا سکتی تھی۔ نور جہاں نے شمشاد کو
 سر ہانے بیٹھ کر کتاب کے اوراق خوب تیزی کیسا تھ پلٹنے شروع کئے تھوڑی دیر میں شمشاد
 کی آنکھ کھل گئی۔

ارے! نور جہاں، تم یہاں کب سے بیٹھی ہوئی۔ شمشاد نے انھیں
 ملتے ہوئے کہا۔

مجھے آئے ہوئے مشکل سے دو تین منٹ ہوئے
 ہوں گے۔ نور جہاں نے جواب دیا
 کسی خاص کام سے آئی ہو، یہ تو تمہارا سونے
 کا وقت ہے۔ شمشاد نے دریافت کیا

کوئی خاص کام تو نہیں ہے، بھابی جان پلنگ پر
 پڑتے ہی گسوئیں مجھے نیند نہ آئی، اکیلی پڑی ہوئی کیا کرتی
 سوچا کہ آپ ہی کے پاس کچھ دیر بیٹھوں گی۔ نور جہاں بولی۔
 شمشاد نے اٹھ کر منہ دھویا، اور تھوڑی سی دیر میں، واپس آگیا، نور جہاں نے

۸۱
 بہت خوب ! مگر ہاں ! ذرا آنکھیں اور بڑی ہونی چاہیے تھیں۔
 یہ تو مصور کا کمال معلوم ہوتا ہے، اتنے حسین بال کسی کے کہاں

ہوتے ہیں۔

عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے، صورت بُری نہیں ہے، آنکھوں میں

کشش پائی جاتی ہے۔

نور جہاں، شمشاد کے چہرے کا بغور مطالعہ کر رہی تھی، اور شمشاد بالکل ڈوب کر،
 تصویریں دیکھ رہا تھا، شمشاد نے الہم کی تمام تصویریں دیکھنے کے بعد، ایک تصویر، نور جہاں کو
 دکھاتے ہوئے کہا،

یہ تصویر سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ناک نقشہ کتنا

موزوں ہے، اور آنکھیں تو اس نے غضب کی پائی ہیں، سادگی

بھولا پس، کشش ! اور کیا چاہیے۔

تو یہ عورت آپ کو پسند ہے۔ نور جہاں نے مسکراتے

ہوئے کہا۔

جو تصویریں تم نے مجھے دیکھنے کے لئے دی ہیں

ان میں یہ تصویر سب سے اچھی ہے۔ شمشاد نے جواب دیا

کل میں نے ایک افسانہ پڑھا تھا، اُس میں لکھا

تھا کہ مرد بہت حُسن پرست ہوتے ہیں، یہی دیکھنے کے لؤ

میں نے الہم کی تصویروں میں سب سے اچھی تصویر کا

آپ سے انتخاب کرایا کہ دیکھوں ! آپ کتنے پانی میں ہیں۔ نور جہاں خاص ناز

کیسا تھہہ ہفتے ہوئے لی

خوبصورتی تو مرد اور عورت دونوں کو پسند ہے۔

اور

اتنے میں باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی، اور نور جہاں اٹھ کر چلی گئی۔ شمشاد مقدمہ کی مثل () دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ شمشاد کے لئے آج کی گفتگو اگرچہ بالکل نئی قسم کی تھی، مگر اُس نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ نور جہاں نے البتہ اس مکالمہ پر تنہائی میں تبصرہ کیا۔

شمشاد سچیں تو نہیں معلوم ہوتا۔ خوبصورتی کی وہ قدر کرتا ہے، اور شکل و صورت کے انتخاب میں خاص سلیقہ رکھتا ہے۔ مگر وہ اتنا خشک کیوں واقع ہوا ہے، اس کو ہمارے یہاں رہتے ہوئے کتنے دن ہو گئے، لیکن اُس نے کسی ہنسی مذاق کی بات میں پہل نہیں کی۔ شاید وہ بے تکلف ہوتے ہوئے شرماتا ہے، مگر ایسی بھی کیا شرم ہے۔ لیکن وہ حساس ضرور ہے، اور شاید بہت

کچھ سمجھتا ہے، اظہار نہیں کرتا۔

نور جہاں کی ہمدردیاں بڑھتی جا رہی تھیں، اور اُس کا بڑناؤ، شمشاد کیسا بہت زیادہ محبت آمیز ہوتا جا رہا تھا۔ شمشاد ایک دفعہ بیمار ہو گیا، بیماری کی ابتدا معمولی زکام اور سنجار سے ہوئی، مگر اسی زمانہ میں مقدمات کی پیروی میں اُس کو ہمہ تن مصروف رہنا پڑا، وقت بیوقت کھانا ملا، اور سویر سویرا، بخار بڑھ گیا، اور شمشاد کو فریش ہو جانا پڑا۔ نور جہاں سارے سارے دن شمشاد کے پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی

رہتی، دو اپلاتی، منہ دہلاتی، تسلی کی باتیں کرتی۔ شمشاد اسکی ہمدردی سے بہت متاثر ہوا، ایک دن شب میں شمشاد کے سر میں بہت زیادہ درد تھا، وہ درد کی شدت سے بے تاب ہو کر رات بھر گھومنے لگا، گھر کے سب لوگ شمشاد کے کمرے میں آگئے، افضل اپنے دوست کا سر دبانے لگا، اور تسلی دینے کے لئے کہتا جاتا تھا۔

بھئی! شمشاد! ذرا سے درد میں بے چین ہو جاتے ہو۔ میں نے جو گولی تم کو دی ہے، اس کے اثر سے اللہ نے چاہا تو ابھی درد بند ہو جاتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تم آج دن بھر کتاب پڑھتے رہے، بس یہ اسی کا اثر ہے، اتنا زیادہ مطالعہ نہ کیا کرو۔

شمشاد اس پر بہت کر کے مسکرایا اور پھر باوجود ضبط کے کراہ نکلی گئی، نور جہاں کی آنکھیں بے اختیار نمناک ہو گئیں، اور وہ آنسو پونچھنے کے لئے باہر چلی گئی، شمشاد چند دن میں اچھا ہو گیا، مگر ابھی کمزوری باقی تھی، ڈاکٹر نے اسے کچھ دن آرام لینے کا مشورہ دیا۔ افضل نے کچہری میں جا کر مقدمات کی پیشیاں ملتوی کر دیں۔

ایک دن شمشاد اور نور جہاں تنہا کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، نور جہاں نے ناگپوری سنترے کی قاشیں چھیل کر شمشاد کے سامنے پلیٹ میں رکھ دیں، شمشاد سنترے کی پھانکیں کھانے لگا۔

بیماری کے بعد بہت سے آدمی بہت زیادہ

خوبصورت ہو جاتے ہیں۔ نور جہاں سنگترے کا

چھلکا رخساروں سے
رگڑتے ہوئے بولی۔

ہو جاتے ہوں گے، ہم نے تو اس کا تجربہ نہیں کیا۔ شمشاد نے بے پروائی
کیساتھ جواب دیا۔

آپ سے بھی بہت بننا آتا ہے، آپ نے بیماری
سے اٹھنے کے بعد اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھا بھی ہے۔ نور جہاں نے کہا۔
جی ہاں! دیکھا ہے، مگر میں تو کوئی تبدیلی محسوس
نہیں کرتا، سوائے اس کے کہ میرے رخسار پچک گئے ہیں
اور چہرہ اٹرا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ شمشاد نے جواب دیا۔

انکسار کی بھی حد ہو گئی۔! اچھا صاحب! آپ
بیمار ہو کر بد صورت ہو گئے ہیں، آپ کا ناک نقشہ بدل گیا
ہے، آپ پہلے کی طرح خوب صورت نہیں رہے۔ نور جہاں بولی۔
یعنی! میں کبھی خوب صورت بھی تھا۔ شمشاد نے مسکراتے

ہوئے کہا۔
آپ ہمیشہ سے خوب صورت ہیں۔ نور جہاں نے شمشاد کی طرف
غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

نور جہاں! تم سے آدمی کو خوب بنانا آتا ہے،
میں اور خوب صورت۔! اتنے موٹے ہونٹ اور اتنی لڑائی
ناک والا آدمی کہیں خوب صورت ہو سکتا ہے۔ شمشاد بولا۔
میری نگاہ میں تو آپ واقعی خوب صورت ہیں، وجاہت
دلکشی پھین، یہ تمام باتیں آپ میں پائی جاتی ہیں۔

۸۵
 شمشاد نے نورجہاں کی باتوں کو حیرت کیساتھ سنا، اور اُس نے فوراً ہی گفتگو
 کا موضوع بدل دیا۔

نورجہاں! تمہارے والد کا جب انتقال ہوا
 ہے تو تمہاری عمر کیا تھی _____ شمشاد نے دریافت کیا

میں بارہ سال کی تھی _____ نورجہاں نے جواب دیا

تمہارے والد، اللہ اُن کو جنت نصیب کرے، تھے بڑے
 ملنسار اور متواضع! مجھ سے بڑی محبت کیساتھ پیش آتے تھے،
 ایک مرتبہ میں اُن سے ملنے کے لئے آیا، مگر میوں کا زمانہ تھا۔ بڑے
 زور کی کُوچل رہی تھی، میں نے مرحوم سے کہا کہ نوکر سے پانی منگو،
 اُنہوں نے آواز دی، اور پھر جب کوئی جواب نہ ملا، تو خود ہی بولے
 میں نے نوکر کو تو ڈاک خانے بھیج دیا ہے۔ یہہ کہہ کر وہ اُٹھے اور
 باہر چلے گئے، میں سمجھا کہ کسی اپنے کام سے گئے ہیں، تھوڑی دیر میں
 کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ جی رونے لگے، آ رہے ہیں، نورجہاں!
 سچ جانو، میں شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ ایسے لوگ دنیا میں
 روز روز تھوڑی پیدا ہوتے ہیں۔ افضل بھی اپنے باپ کو پڑا ہے
 بہت سی باتیں شیخ صاحب مرحوم سے ملتی ہوئی ہیں۔

شمشاد کی موضوع سے ہٹی ہوئی گفتگو کو، نورجہاں نے بے دلی کیساتھ سنا، باپ
 کی تعریف ہر بیٹے اور بیٹی کو اچھی معلوم ہوتی ہے، لیکن نورجہاں، باپ کی تعریف
 میں اس وقت کوئی قصیدہ سننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اُس نے تھوڑی دیر سکوت

کے بعد کہا:۔

میری بات کا تو آپ نے جواب دیا ہی نہیں، دوسری بات
چھیڑ دی، خول بصورت آدمی، شرمابھی تو جاتے ہیں، شاید اسی لئے
آپ نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔
اسپر شمشاد بولا:۔

یہ تم نے آج نورجہاں! خول بصورتی اور بد صورتی کا جھگڑا
بلا وجہ کیوں کھڑا کر دیا، کوئی کام کی بات کرو، اچھا یہہ تو بتاؤ، تم
کو اپنے آبا سے زیادہ محبت تھی یا اماں سے۔۔۔۔۔!
نورجہاں نے اس کے جواب میں چیں چیں ہو کر کہا:۔
دونوں سے محبت تھی۔

شمشاد نے اس پر کہا:۔

میں نے تو سنا ہے کہ لڑکیوں کو اماں سے زیادہ محبت ہوتی

ہے، میں یہی بات پوچھنا چاہتا ہوں۔

نورجہاں کے لب پورے طور پر ہلنے بھی نہ پائے تھے کہ چھو کرے نے آکر کہا،
کہ بگم صاحبہ آپ کو بُلار ہی ہیں، کوئی ضروری کام ہے۔ نورجہاں اٹھ کر چلی گئی۔
شمشاد آج گفتگو کو سُن کر سوچ میں پڑ گیا، وہ بہت دیر تک غور کرتا رہا، اور اسی
حالت میں اُس کو نیند آگئی۔

اس گفتگو کے بعد شمشاد، نورجہاں سے ملے ہوئے کترانے لگا، وہ نورجہاں
کو تنہائی میں اپنے پاس آنے کا بہت ہی کم موقعہ دیتا تھا۔ شمشاد جتنی زیادہ احتیاط برتنا

تھا، نورجہاں اتنی ہی زیادہ قریب اور بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ شمشاد کا احتیاط اور سکوت، نورجہاں کی متوجش حرکات، ان تمام باتوں نے گھروالوں کی توجہ کو چوٹکادیا۔ اور نادارہ دونوں کی حرکات و سکنات کا گہری نگاہوں سے مطالعہ کرنے لگی۔ شمشاد، کچھری کے کام سے فارغ ہو کر، شہر میں کسی دوست کے یہاں چلا جاتا، یا افضل کے پاس دوکان پر آ بیٹھتا، اور اکثر و بیشتر مکان ایسے وقت پہنچتا کہ کھانے کے لئے سب لوگ منتظر ہوں، افضل بھی اُس وقت تک آ جاتا تھا، کھانے کے بعد ادھر ادھر کی بات چیت ہوتی اور سب لوگ سو جاتے۔

ایک دن صبح کا وقت زمانہ کے برآمدے میں، شمشاد چوکی کے قریب کھڑا ہوا، گلاس کھنگال رہا تھا، شمشاد کے ہاتھ سے گلاس فرش پر گر کر چھین سے ٹوٹ گیا اور شیشہ کا ایک ٹکڑا اس کے پیر میں چبھ گیا، گلاس کے گر کر ٹوٹنے کی آواز سن کر سب لوگ متوجہ ہو گئے، نورجہاں نے دیکھا کہ شمشاد جھک کر پیر کو سہلا رہا ہے، اور پتھر پر سرخی مائل پانی بہ رہا ہے، وہ دوڑی ہوئی آئی، اور یہہ دیکھ کر شمشاد کے پیر سے لہو بہ رہا ہے، اُس نے جھک کر اپنے دوپٹہ کو پانی میں بھگوایا اور زخم پر رکھ دیا۔ چوٹ تو زیادہ نہیں لگی تھی، لیکن جوان آدمی کی رگ خون بہانے میں بڑی فیاض ہوتی ہے، نورجہاں کے دوپٹہ کا پلو لہو میں تر بتر ہو گیا۔ نادارہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی، اُس نے دیکھا کہ نورجہاں دوپٹہ کے پلو کو لہی کے پیر پر رکھے ہوئے بیٹھی ہے۔

بھائی جان! کیا ہوا _____ نادارہ نے دریافت کیا

کچھ نہیں! گلاس میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا، اسکی

اس کاشیشہ پیر میں چہہ جانے کے سبب خون نکل آیا۔

تھوڑی دیر میں خون بند ہو گیا، اور زخم پر دھجی باندھ دی گئی، شمشاد
تانبے میں بیٹھ کر کچہری چلا گیا، دوپہر کو جب نادّہ اور نور جہاں گھر کے کام سے
فارغ ہو کر آرام کرنے کے لئے لیٹیں، تو نادّہ نے نور جہاں سے کہا:-

نور جہاں۔ اتم نے اتنے قیمتی دوپٹے کو خاک میں ملا دیا،
ایسی ہی ہمدردی کرنی تھی تو گھر میں بیسیوں کپڑے تھے،
میں نے دوپٹے کی کورس محنت سے تیار کی تھی۔!

اس پر نور جہاں بولی:-

بھابی جان! واقعی مجھ سے چوک ہو گئی، مگر میں کیا
کروں، شمشاد صاحب کے پیر کو لہو لہان دیکھ کر، مجھ سے نہ
رہا گیا، اور میں نے بالکل بے اختیاری کے عالم میں
اُن کے زخم پر دوپٹے کا پلور رکھ دیا۔
نادّہ نے اس کے جواب میں کہا:-

نور جہاں۔ اتمھاری اس ”بے اختیاری“ کا تو میں

بہت دن سے مطالعہ کر رہی ہوں، اور اب یہ بے اختیاری
بڑھتی جا رہی ہے۔ دیکھو! میں تم کو آگاہ کرتی ہوں، کہ شمشاد
سے زیادہ گھل مل کر بات چیت نہ کیا کرو، زمانہ خراب ہو
لوگ ذرا سی بات کو نمک مرچ لگا کر کچے سے کچے بنا دیتے ہیں۔

نور جہاں، نادّہ کی اس گفتگو پر گھبرا گئی، اُس نے ذرا سی دیر میں کئی

مرتبہ ہونے پر جو خشک ہوئے، زبان پھیری، اور لسی منٹ کی سلسل خاموشی کے بعد بولی:-

بھابی جان! آپ بھی ایسا خیال کرتی ہیں، آپ سے تو مجھے تو ایسی امید نہ تھی۔

نادرہ نے اس پر نور جہاں کو خوب ڈانٹا کہ زیادہ منطق نہیں چھانٹا کرتے جو کہ دیا اُس پر عمل کرو، شریف ہو، بیٹیوں کو گھر والوں کے اشاروں سے سب کچھ سمجھ جانا چاہیئے۔ نور جہاں، اس پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئی، اور اُس وقت جب کہ خراٹے بھر رہی تھی، نور جہاں کی معصوم آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے، شمشاد بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا، اور نور جہاں بھی نادرہ کی گفتگو کے بعد محتاط ہو گئی تھی، مگر بدگمانی، ہمیشہ ہتھیلی پر سرسوں جانے کی کوشش کرتی ہے، اور مشکوک نگاہ بعض وقت پھول کی پتی کی کور کو تلوار کی دھار سمجھنے لگتی ہے۔
ہماری معاشرت کے بہت سے حزیں افانوں کا موضوع یہی ”بدگمانی“ ہے۔
بدگمانی ایک ایسا پودا ہے جو آبِ یاری کے بغیر ہی پھولتا پھلتا ہے، یہاں تک کہ اُس کے گھنی ڈالیاں تخیلات پر چھا جاتی ہیں۔

شمشاد کے گھر میں قدم رکھتے ہی نادرہ کی بدگمان نگاہیں، شمشاد اور نور جہاں کی حرکات و سکنات کی ٹوٹل میں مصروف ہو جاتیں۔ وہ بغور دیکھتی تھی کہ کس انداز کساتھ منہس رہی ہے، اور شمشاد کن نگاہوں سے اُس کو دیکھ رہا ہے۔ نادرہ جب کوئی چیز، شمشاد کو دیتی، تو شمشاد کی نگاہیں ہاتھ کی جنبش، انگلیوں کی حرکت، کلائی کے موڑ اور ہتھیلی کی گردش کو دیکھتیں

کسی کو کوئی چیز، خواہ کتنی ہی احتیاط سے دی جائے، ایک دوسرے کے ہاتھس ہو ہی جاتے ہیں، نورجہاں یا شمشاد کا ہاتھ اگر کبھی چھو جاتا، تو نادِرہ ہی سمجھتی کہ یہ قصداً ایسا ہوا ہے۔ نورجہاں اگر کبھی کوئی شعر گنگنا تے لگتی، تو نادِرہ بہت غور کیا تھ سنتی، اور شعر میں محبت کا لفظ سننے ہی، شمشاد اُس کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔ یہی بیسرویا باتیں بدگمانی کی نشوونما کرتی رہتی ہیں۔

نادِرہ نے کچھ دنوں تک تو افضل سے اپنے دل کی بات چھپائی، مگر آخر اُس سے نہ رہا گیا، ایک دن اُس نے باتوں باتوں میں 'سرسری طور پر' اپنی بدگمانی کا اظہار کر دیا۔ اُس کی گفتگو کا انداز بہت زیادہ ہمدردانہ، سنجیدہ اور متین تھا، مگر افضل کے لئے یہہ سرسری باتیں بھی بہت کچھ تھیں شمشاد اس کا بہت گہرا دوست تھا، لیکن نادِرہ کی باتیں سننے کے بعد اُس کے دل کی وہ گنجائش، جو شمشاد کے لئے وسیع تر ہوتی رہتی تھی، یکایک سمٹ گئی۔ افضل نے نورجہاں اور شمشاد کی کھپلی باتوں پر اب غور کیا، تو واقعتاً اور بدگمانیوں کی کڑیاں ملتی چلی گئیں، اُس نے اسی وقت شمشاد کا سالِ مردانے حصہ میں بھجوا دیا۔ شمشاد آیا تو اس تبدیلی کو دیکھ کر وہ متحیر ہوا۔ افضل نے اس پر بہت ہی بے پروائی کیساتھ کہا کہ مردانے میں ہی آپ زیادہ بے تکلفی کیساتھ رہ سکتے ہیں۔ شمشاد نے افضل کو سر سے پتہ تک دیکھا، افضل بھویں تنی ہوئی تھیں، اور اب وہ بالکل بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ شمشاد نے باتیں شروع کیں تو افضل نے بعض باتوں کا جواب ہی نہیں دیا۔ ایک

آیا مگر میرے خیال میں افضل اتنا کم طرف نہیں ہے، آج وہ کسی خاص وجہ سے متاثر تھا، بعض وقت آدمی کسی خاص صدمہ اور فکر سے متاثر ہو کر، روکھی پھکی باتیں کرنے لگتا ہے، ممکن ہے صبح تک اُس کا مُوڈ () بدل جائے، رات کو سونے کے بعد آدمی کے جذبات اور تاثرات میں بہت کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے، مگر مجھے اب قیصر پور چلا جانا چاہیئے، وکیل، مختار مقدمات کی نوعیت سے واقف ہو گئے ہیں، وہ خود کام کرتے رہیں گے، میری ضرورت ہوئی، توقیر پور سے ایک دو دن کے لئے آجایا کروں گا۔

اپنے دل ہی دل میں، اُس قسم کی باتیں کرتے کرتے اُسو نیند آگئی۔ صبح شمشاد ذرا دیر سے اُٹھا، حواج سے فارغ ہو کر، نماز پڑھی، اتنے میں افضل آگیا۔ افضل کا چہرہ رات کے مقابلہ میں، اور زیادہ، خشمگیر تھا اور اُس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔

افضل! میں آج قیصر پور جانا چاہتا ہوں، اب مقدمات کی پیروی کی ضرورت نہیں رہی، بھائی! آپ کو میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی، شمشاد نے کہا، آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ افضل نے بدلے ہوئے تیور سے جواب دیا۔

شمشاد کو اس قسم کے جواب کی افضل سے توقع نہ تھی، وہ افضل کا

میں اسی ٹرین سے جانا چاہتا، بھابی جان اکو ذرا خبر کر لو،
وہ سکایت کریں گی کہ مجھ سے ملے بغیر ہی چلے گئے۔ شمشاد نے کہہ
آپ کے تشریف لیجائیے بعد آپ کا پیغام پہنچا دیا جائیگا
آپ تو شمشاد صاحب بہت زیادہ طویل گفتگو کیا کرتے ہیں۔
شمشاد نے دیکھا کہ افضل ہر سیدھی بات کا جواب اُلٹا دیتا ہے، اور وہ
غیر معمولی رکھائی اور بے نیازی سے پیش آ رہا ہے، اُس نے کمرے میں جا کر سامان در
کیا، ملازم کو بھیج کر تانگہ منگایا اور جب شمشاد تانگے میں بیٹھنے لگے تو
افضل اندر چلا گیا۔ شمشاد تانگے میں بیٹھ کر اسٹیشن پہنچا۔ اور پہلی ٹرین سے قیصر پور
جا کر دم لیا۔

قیصر پور کے لوگوں کی تو عید ہو گئی۔ کئی مہینہ کے بعد شمشاد وطن واپس ہوا تھا
کئی دن تک متواتر لوگ اُس سے ملنے کے لئے آتے رہے، شمشاد کو یہ معلوم کر کے اطمینان
ہوا کہ اُس کے پیچھے بھی بعض لوگوں نے تھوڑا بہت کام کیا۔ مخالفین کا زور بڑی حد
کم ہو گیا تھا، مگر بعض شریر اور فتنہ پرداز اب بھی مورچہ جمائے ہوئے تھے۔ شمشاد اپنے
اصلاحی پروگرام کو کامیاب بنانے میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ افضل کا سلوک چند
تک اُس کے لئے سہوان روح کا باعث بنا رہا۔ مگر وہ اپنے کام میں اُس کو جھول گیا۔
بات یہی تھی کہ شمشاد دوستوں کی بدسلوکیاں بہت جلد جھول جاتا تھا، اسکی فطرت کینہ کی سطح
سے بہت بلند تھی۔

۱۹۴ نامہ و پیام

محبت کی راہ میں جب رکاوٹیں پیش آتی ہیں، تو جذبہ شوق اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ آدمی اگر چاہے تو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتا ہے، مگر کسی انسان کے دل کے ایک گوشہ کو بھی اوہر سے اُدھر نہیں کر سکتا۔ نظراور زبان پر پابندی عاید کیج سکتی ہے، مگر دل پر کوئی پہرہ نہیں بٹھا سکتا۔ محبت کی اسی کشمکش نے تاریخ کے بہت سے اوراق کو خونِ تمنا سے رنگین کر دیا ہے۔ محبت بالکل غیر اختیاری چیز ہے، آدمی اگر خود بھی کسی سے محبت کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا عقل محبت پر ہمیشہ خندہ زن رہی ہے، بات یہ ہے کہ محبت کے کاروبار عقل کی سمجھ میں نہیں آتے عقل ہر چیز کو افادیت کے ایک خاص زاویہ نگاہ سے دیکھتی ہے، اور محبت کی دُنیا سودوزیاں کے تصور سے پاک ہوتی ہے، وہاں تو صرف اُچھٹی ہوئی نظر پر دل و جان کو نچھاور کر کے بعد بھی اُس نگاہِ غلط انداز کی توجہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔

اے کمی پُرسِ چرا جامے بہ جانے میدی
ابنِ سخن با ساقی ماگو کہ ارزاں کردہ است

ایک مغربی شاعر نے تو محبت کو تو ”خدا“ تک کہہ دیا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ محبت ”زندگی“ کا دوسرا نام ہے، اور جہاں حیات پائی جاتی ہے وہاں محبت بھی ضرور پائی جاتی ہے۔ اور محبت کا یہ سلسلہ انسانوں سے گذر کر جانوروں اور نباتات تک پھیلا ہوا ہے۔

شمشاد کی جدائی نور جہاں کو بہت گراں گذری، اُس نے بہت کچھ ضبط کر نیکی
 کوشش کی، مگر دل کی بے تابی نے ضبط کے دامن کو اُس کے نازک ہاتھوں سے چھڑا دیا،
 اُس نے شمشاد کو قیصر پور کے پتہ پر کئی خطوط لکھے جس میں کبھی اشاروں اور استعاروں میں
 کبھی کھل کر اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا شمشاد نے کئی خطوں کا جواب نہیں دیا پہلی وجہ تو یہ
 تھی کہ اُسے اپنے کاموں میں سے فرصت نہ تھی، دوسرے وہ اس نے کو بڑھانا نہیں چاہتا
 تھا، اُس کا خیال تھا کہ جب خطوں کا جواب نور جہاں کو نہ ملے گا، تو وہ خود ہی خاموش ہو جائیگی
 لیکن محبت کی دنیا کا تو دستور ہی نرالا ہے، بھائیں اور زیادہ جذبہ کو مشغول کرتی ہیں وہ
 شوق کی آگ بے مہربوں کے دامن کی ہوا سے ہی تیز ہوتی ہے محبت میں اگر وفا کا جوا
 وفا سے دیا جائے، تو محبت صرف ”فلسفہ“ بن کر رہ جائے، یہاں تو زخم کھانے، رنج سہنے
 وہ وفا کر لے اور یا مال و تباہ ہونے ہی میں لطف آتا ہے۔

دل غمگین ملائی یہ جفا ہے تو خوش است

اے جفا ہائے تو خوش تر ز وفائے دگراں

نور جہاں شمشاد کے سکوت سے نا اُمید نہیں ہوئی، خطوں کا سلسلہ برابر جاری
 تھا شمشاد نے یہ رد کیجھ کر کہ یہ سہیلا بڑھا چلا آ رہا ہے، کئی خطوں کا جواب لیا۔ اُس کے
 ایک خط سے، اُسکی ذہنیت، اور اُس کے دوسرے خطوں کے مضمون کا اندازہ لگایا
 جاسکتا ہے۔

عزیزہ نیک سیر۔ !

اس قسم کی خط و کتابت تمہارے لئے کسی طرح زیبا نہیں،
 میں تم کو اس قسم کے خیالات سے بہت بلند سمجھتا ہوں، مگر شاید تم

مجھ سے مذاق کر رہی ہو! لیکن اس طرح کا مذاق بھی مناسب نہیں!
 تمھارے لکھے ہوئے اشعار میری سمجھ میں نہیں آتے شریف ٹیکوں
 کو شعر شاعری سے اجتناب کرنا چاہیے یقین ہے کہ تم اپنے
 بڑے بھائی کا دوست سمجھ کر میری نصیحت پر عمل کرو گی۔ خدا کی قسم
 میرے نیک کام میں ایسے خلوک کو بھیج کر مشکلات پیدا نہ کرو۔ ”شمشاد“
 شمشاد نے اپنے اور افضل کے متعلق ایک لفظ بھی کسی سے نہیں کہا، لیکن یارو
 توقیامت کے پرکالے ہوتے ہیں، اُن کو جب معلوم ہوا کہ شمشاد اور افضل کے تعلقات میں
 پہلی سی گر جوشی نہیں رہی، تو انھوں نے معاملہ کی ٹوہ لگانا شروع کی۔ اور شمشاد کے لفظ
 افضل کے پاس آنے جانے لگے، افضل نے شمشاد کے متعلق اُن سے کچھ پوچھا، تو ان
 لوگوں نے من گھڑت افسانے سنا کر، افضل کو اور زیادہ بدظن کر دیا۔ افضل نے
 ان لوگوں کی باتیں سُن کر خدا کا شکر ادا کیا کہ شمشاد کا اُس کے گھر سے چلا جانا اچھا
 ہوا، ورنہ یہہ دوستی رنگ لاتی۔

ہولناک اقدام

ایک دن افضل دوکان پر بیٹھا ہوا تھا، ہولی کا دن تھا، ہندو ہولی کھیل رہے
 تھے، شہر کی گلیوں میں اُدھم مچ رہا تھا، آدمی تو آدمی دیواروں کو بھی عبیر و گلال نے
 سُرخ بنا دیا تھا۔ کنواری لڑکیوں کی ٹولیاں، پچکاریاں لٹے ہوئے گھوم رہی
 تھیں، بازار کھلا ہوا تھا، مگر گاہک بہت کم نظر آتے تھے، تماشا یوں کی کثرت بھی

افضل کا ملازم دوپہر کا کھانا دینے کے لئے دوکان پر گیا، اور کھانا رکھتے ہی چل دیا ملازم مشکل سے دس بارہ قدم گیا ہوگا کہ افضل نے اسے آواز دیکر بلایا، اور غصہ کیا تھا بولا کہ تم نہایت نامعقول ہو، کھانا رکھتے ہی چل دے، ملازم نے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں بی بی نے مجھے ایک لفافہ دیا ہے کہ اسے اسی وقت ڈاک خانہ میں ڈال دینا۔ افضل نے ملازم کے ہاتھ سے لفافہ لیلیا، اور شمشاد کا پتہ پڑھتے ہی اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا، اس نے لفافہ کو کھینچتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ خط کا مضمون پڑھ کر وہ غصہ کے مارے بید کی طرح کانپنے لگا، وہ اسی عالم میں بڑبڑانے لگا۔

شمشاد! دوستی کا خوب حق ادا کیا، مگر دوست تیرے اس محبت کے قلعہ کو آج ہی سمار کئے دیتا ہوں، شریف لوگ عزت کی خاطر سرکٹا نکھیل سمجھتی ہیں کھیل افضل دوکان کے اندر آگیا، اور بھرے ہوئے سپتول کو جو دوکان میں لٹکا ہوا تھا جیب میں رکھ کر باہر آیا۔ اتنے میں ایک شخص جو قیصر پور کا رہنے والا تھا افضل کی دوکان پر آگیا، اور اس کی زبانی معلوم ہوا کہ شمشاد آج صبح ہی قیصر پور سے آیا ہے، اور اسٹیشن کے قریب ہوٹل میں ٹھہرا ہے، کچھ برادھر اُدھر کی بات چیت کر نیچے بعد قیصر پور کا وہ آدمی چلا گیا، اور افضل نے عتاب آمیز مسکراہٹ کیا تھا، شکار خود ہی آگیا پہلے مجھے اسی مرد کا جھگڑا ختم کر دینا چاہیے۔ افضل کا چہرہ انتہائی بھیانک ہو گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسکی آنکھوں کی کسی چنگاری بھردی ہیں، دوکان کا گاہک اُسی کی دوکان پر آئے تو اس کے انداز دیکھ کر کپڑا مول لئے بغیر ہی چلے گئے۔

افضل نے شام ہی سے دوکان بڑھا دی، وہ دوکان سیسید ہا ہوٹل پہنچا بھرا ہوا سپتول اسکی جیب میں پڑا ہوا تھا، اور وہ ہوٹل کے زینہ پر تیز تیز چڑھ رہا تھا، ہوٹل کے ملازمین کو پوچھنے پر اسے معلوم ہوا کہ شمشاد ابھی ابھی ٹیلے کے قریب کھیتوں میں ٹھہلنے کیلئے چلا گیا ہے۔ افضل کا چہرہ

خوشی سے چمک اٹھا کہ اب تو کوئی رکاوٹ ہی باقی نہیں رہی۔ وہ ہٹل سے سیدھا ٹیلے کو قریب بھونچا، کون چھپ چکا تھا، ہرے بھرے کھیت جن کی کونپلوں کو ابھی ابھی سورج کی کرنیں چوم رہی تھیں، اب دھندلکے کی گود میں سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ شمشاد گہوؤں کے کھیت کی مینڈہ پر لگنا تا ہوا ہٹل رہا تھا، اور چھڑی سے پودوں کو ہٹو کے دیتا جاتا تھا۔ افضل ٹیلے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا، اور جب شمشاد اُس کے قریب آیا، تو اُس نے گولی چلا دی، شمشاد ہائے میں مر گیا، کہہ کر دھڑام سے کھیت میں گر پڑا، اور افضل وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ کھیتوئیں کسانوں کی دو چار چھوٹی پٹیاں تھیں، گولی کی آواز سن کر کسان موقع پر دوڑے ہوئے آئے، شمشاد کھیت کی کیاری میں تڑپ رہا تھا، کسانوں نے ایک اُجلے پوس کو خاک و خون میں تڑپتے دیکھ کر شور مچانا شروع کیا، اور ان کی آن میں بہت سے آدمی جمع ہو گئے، شمشاد اب بیہوش ہو چکا تھا، لوگ اُسے اٹھا کر دو خانے میں لے گئے۔ گولی سیدھے ہاتھ پر لگی تھی، بہت سا خون نکل جائیکے باعث شمشاد پر غشی طاری ہو گئی، ڈاکٹروں نے ہاتھ سے گولی نکالی، اور کہا کہ اس شخص کی زندگی تھی، ورنہ اگر کہیں سینہ یا پیٹ پر ذرا ہٹ کر گولی لگ جاتی تو معاملہ ختم تھا، شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی کہ ٹیلے کے قریب ایک شخص کو کسی نے گولی سے ہلاک کر دیا۔

افضل اپنی والنت میں شمشاد کو ہلاک کر چکا تھا، اُس کی آنکھوں سے سچ مچ خون برس رہا تھا، اُس نے گھر پہنچ کر چیختے ہوئے کہا، شمشاد کو تو میں نے موت کے گھاٹ اتار دیا، اب اونگہ خاندان نو زجہاں! تیری باری ہے۔ تو زجہاں برآمدے میں بیٹھی ہوئی چھالیاں کاٹ رہی تھی، اور اُس کی چوڑیوں کا نعمہ فضا میں رقص کر رہا تھا، بھائی کی باتوں کو اُس نے پورے طور پر سنا تھا، کیوں کہ غصہ کے جوش میں افضل

سے پوری بات ادا نہ ہوتی تھی، لیکن ملازم نے چونکہ نورجہاں کے پوچھنے پر کہہ دیا تھا کہ افضل نے اُس کا دیا ہوا لفاظہ اُس سے لے لیا، اُس نے بھائی کی اس خفگی کا سبب وہ سمجھ چکی تھی افضل زمانہ مکان کے صحن میں مہل جملے کہتا ہوا داخل ہوا۔

دونوں کا خون۔ بغیر، شرافت۔ انہیں چھوڑ سکتا

میں پھانسی۔ ہاں، خوشی سے تیار۔ !۔۔

نورجہاں، اندر کمرے میں گئی، اور وہاں سے ایک لفاظہ لیکر، جیسے ہی باہر آئی، افضل نے اُس پر فایر کر دیا۔ نورجہاں چکر کھا کر زمین پر گر پڑی۔ سب لوگ نورجہاں کو اٹھانے کے لئے دوڑے، افضل کے ہاتھ میں پستول لگا ہوا تھا، اور وہ اول خول بک رہا تھا۔ نورجہاں جب زمین پر گر گئی ہے، تو اُس کے ہاتھ کا لفاظہ، افضل کے قریب آ کر گرا۔ افضل نے اُس لفاظہ کو اٹھا لیا۔ اور نورجہاں کے پراسرار خطوط سمجھ کر، لفاظہ کے کاغذات پڑھنے لگا، اس لفاظہ میں شمشاد کے وہ خطوط تھے، جو اُس نے نورجہاں کے خطوط کے جواب میں بھیجے تھے۔ وہ خطوط کو پڑھنا جانتا تھا اور اُس کا چہرے کا رنگ بدلتا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے آگ کوئی پانی چھڑک رہا ہے اور شعلوں کی بلندی، تدریجاً کم ہوتی جاتی ہے، وہ پاگلوں کی طرح چلا کر بولا۔

بیگنا ہوں کے خون۔ اب میں جی کر کیا کروں گا۔

یہ کہہ کر اُس نے پستول کو اپنی طرف سیدھا کیا ہی تھا کہ ماما نے جو اس کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کا ہاتھ تھام لیا، افضل نے ہاتھ کو جھٹکا دیا، اور گولی افضل کے پیروں کو توڑتی ہوئی نکل گئی، افضل بھی برآمدے میں ترپنے لگا، اور تھوڑی دیر میں

دونوں زخمیوں کو لوگ اٹھا کر اُسی دواخانے میں لے گئے، جہاں شمشاد پڑا ہوا تھا، نورجہاں کے بھی ہاتھ ہی میں گولی لگی تھی رات ہی میں ڈاکٹروں نے ان دونوں کی بھی مرہم پی کی۔ کئی دن تک ان تینوں زخمیوں کی یہ حالت رہی کہ تھوڑی دیر کے لئے ہوش آگیا، تو بہت دیر کے لئے بیہوش ہو گئے دوسرے ہفتہ میں حالت سنبھلنی شروع ہوئی۔ افضل کا زخم بہت جلد بھر گیا، اور جب اسکی حالت سنبھل گئی۔ نورجہاں اور افضل کو الگ الگ وارڈوں میں رکھا گیا تھا، اور نورجہاں کی حالت سنبھلنے پر بھی، اُس سے شمشاد کے زخمی ہونے کے واقعہ کو چھپایا گیا۔ مگر جس دن شمشاد نے اُس کو دیکھنے کے لئے جانا چاہا اُس دن اُٹا کی نرس نے نورجہاں سے پورا واقعہ بیان کر دیا۔

شمشاد نے جب ڈاکٹروں سے کہا کہ وہ نورجہاں کو دیکھنے کے لئے جانا چاہتا ہے، تو انہوں نے سختی کیساتھ مخالفت کی، شمشاد بالکل بے بس تھا، یہہ دواخانے بھی بعض وقت قید خانے بن جاتے ہیں۔ اُس نے دواخانہ کے ملازم کے ہاتھ، نورجہاں کے پاس ایک پرچہ بھیج دیا، جس میں لکھا تھا:۔

ایک ہی نشانہ کے دو زخمی، اب —

ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

نورجہاں کا زرد چہرہ، اس پرچہ کو پڑھ کر گلاب کی طرح سُرخ ہو گیا۔ وہ آج سے زیادہ اپنی زندگی میں کبھی خوش نہیں ہوئی تھی۔

